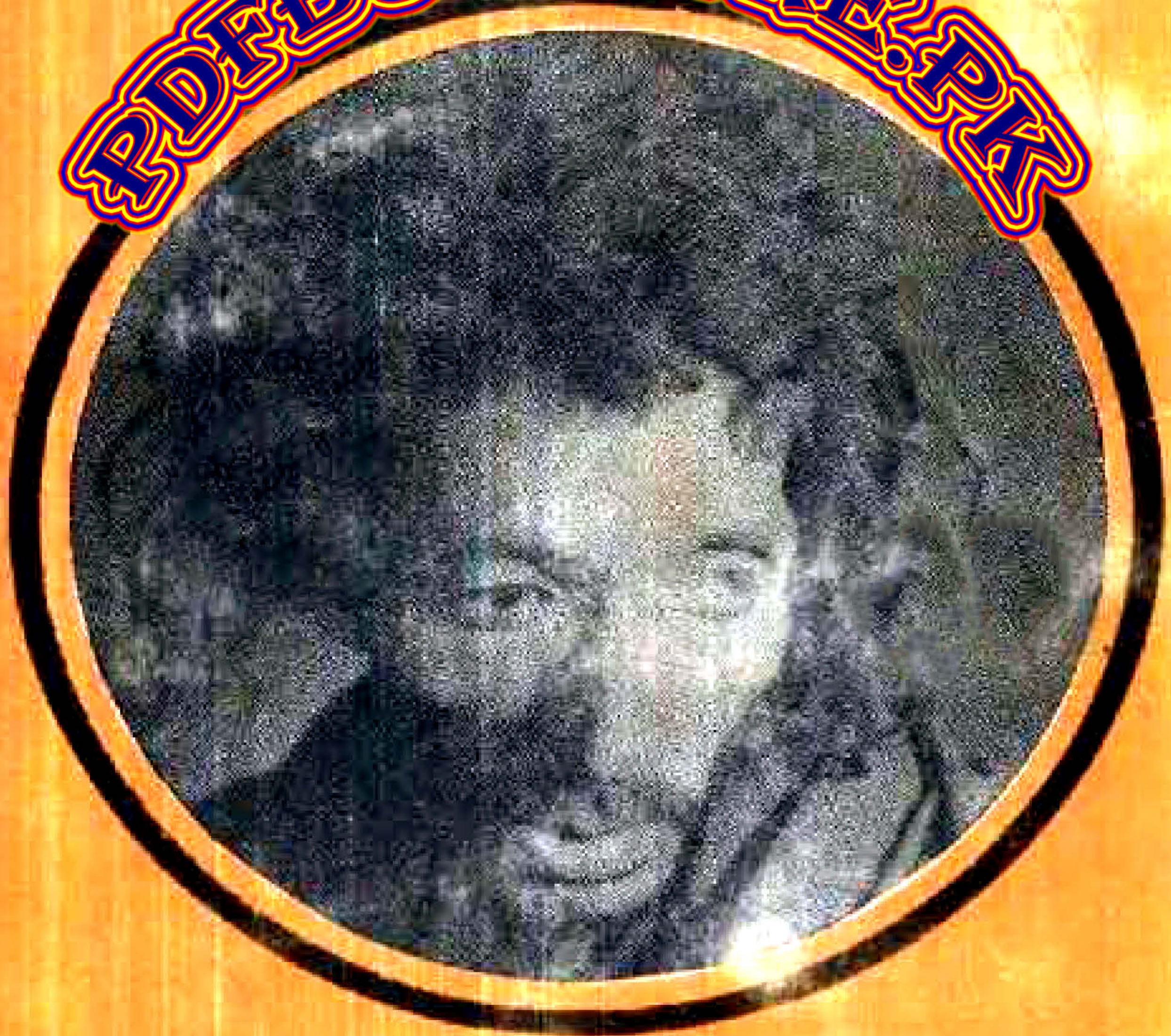
شکستِ ساغر



یک سماجی المیے کی داستان

یونس ادیب

شکستِ ساغر

زندگی کے جبرِ مسلسل کی داستان

ساغر صدیقی

کی زندگی پر یونس ادیب کی ایک انوکھی تحریر

•

ستارہ پبلیکیشنز ۔ لاہور
پوسٹ بکس نمبر ۱۴۷

یونس ادیب

درمیانہ قد، فکر آثار چہرہ، آنکھوں پر عینک، پتلون قمیض میں ملبوس ایک جیتا جاگتا آدمی ۔ یہ ہے یونس ادیب ۔۔ اُس کے ظاہری رکھ رکھاؤ کو دیکھو تو وہ ایک پُر سکون، خوشگوار، مؤدب اور دوست نواز آدمی ہے ۔ لیکن جب اُس سے مزید تعارف ہو، اُس کے دل اور ضمیر میں جھانکا جائے، تو وہ بلا کا تیز، صاف گو، طوفانوں کا دلدادہ اور غیر مصالحانہ رویّہ رکھنے والا نوجوان نظر آتا ہے۔

یونس ادیب درمیانہ طبقے سے تعلق رکھتا ہے۔ لیکن اس طبقے کے بالائی حصّے سے نہیں جس کا وظیفۂ حیات بینکروں، ملوں کے مالکوں اور پونجی پتیوں کی کاسہ لیسی کرنا ہوتا ہے۔ وہ درمیانہ طبقے کی اس متحارب اور آبرومند شاخ سے تعلق رکھتا ہے۔ جس کا رشتہ عوام سے ہوتا ہے ۔ جس سے تعلق رکھنے والے افراد عوام سے محبت کرتے ہیں، اُن کے دُکھ سُکھ میں شریک ہوتے ہیں اور ان کے مستقبل کے لئے فکر و احساس کا تانا بانا بُنتے رہتے ہیں ۔

اوبیانہ آشفتگی، آوارگی اور یونس ادیب لازم و ملزوم ہیں ۔ وہ آپ کو لاہور کی ہر سڑک پہ نظر آئے گا، ہر محفل میں دکھائی دے گا، ہر فکری اجتماع میں سرگرم محسوس ہوگا، وہ اپنی آشفتگی اور آوارگی کے باوصف خالی خولی انسان نہیں۔ فکری اور نظری طور پر منجھا ہوا ہے۔ مصائب زندگی میں تیغ بدست رہا ہے ۔ نامساعد حالات کے باوجود بڑی سلیقہ مندی سے اپنے آپ کو سنبھالے ہوئے ہے۔ بعض اوقات مجھے وہ ہوا کا ایک ایسا جھونکا محسوس ہوتا ہے جس کے دامن میں ڈھیر ساری خوشبوئیں ہوں جسے وہ ادائے معصومیت سے ہر طرف بکھیرتا چلا جا رہا ہو۔

Yunus Adeeb, P.O. Box 1947, Lahore (Pakistan)

SAGHAR ART SOCIETY

Legal Advisor : AITZAZ AHSAN
Barrister-at-Law

ASGHARI ALI CHAUDHRY
Advocate

ناشر : محمد آصف علی

طابع : منظور پریس

سرورق : سہیل خان

قیمت : [redacted] روپے

یکے از مطبوعات

ستارہ پبلیکیشنز، پوسٹ بکس نمبر ۱۹۴۷ - لاہور

یونس ادیب

درمیانہ قد، فکر آثار چہرہ، آنکھوں پر عینک، پتلون قمیض میں ملبوس ایک چلتا پھرتا آدمی — یہ ہے یونس ادیب — اُس کے ظاہری رکھ رکھاؤ کو دیکھو تو وہ ایک پُر سکون، خوشگوار، مؤدب اور دوست نواز آدمی ہے۔ لیکن جب اُس سے مزید تعارف ہو، اُس کے دل اور ضمیر میں جھانکا جائے، تو وہ بلا کا تیز، صاف گو، طوفانوں کا دلدادہ اور غیر مصالحانہ رویّہ رکھنے والا نوجوان نظر آتا ہے۔

یونس ادیب درمیانہ طبقے سے تعلق رکھتا ہے۔ لیکن اس طبقے کے بالائی حصّہ سے نہیں جس کا وظیفۂ حیات بینکروں، ملوں کے مالکوں اور پونجی پتیوں کی کاسہ لیسی کرنا ہوتا ہے۔ وہ درمیانہ طبقے کی اس متحارب اور آبرومند شاخ سے تعلق رکھتا ہے۔ جس کا رشتہ عوام سے ہوتا ہے۔ جس سے تعلق رکھنے والے افراد عوام سے محبت کرتے ہیں، اُن کے دُکھ سُکھ میں شریک ہوتے ہیں اور اُن کے مستقبل کے لئے فکر و احساس کا تانا بانا بُنتے رہتے ہیں۔

ادیبانہ آشفتگی، آوارگی اور یونس ادیب لازم و ملزوم ہیں۔ وہ آپ کو لاہور کی ہر سڑک پر نظر آئے گا، ہر محفل میں دکھائی دے گا، ہر فکری اجتماع میں سرگرم محسوس ہوگا، وہ اپنی آشفتگی اور آوارگی کے باوصف خالی خولی انسان نہیں۔ فکری اور نظری طور پر منجھا ہوا ہے۔ مصائب زندگی میں تیغ بدست رہا ہے۔ نامساعد حالات کے باوجود بڑی سلیقہ مندی سے اپنے آپ کو سنبھالے ہوئے ہے۔ بعض اوقات مجھے وہ ہوا کا ایک ایسا جھونکا محسوس ہوتا ہے جس کے دامن میں ڈھیر ساری خوشبوئیں ہوں جسے وہ ادائے معصومیت سے ہر طرف بکھیرتا چلا جا رہا ہو۔

ٹ جائے تو کج کلاہ ہے۔ لیکن عمومی حالات میں قانع ، درویش ہے اور درویشوں کی برادری سے ناطہ جوڑ کر خوش ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ساغر صدیقی کی موت کے بعد اس کے کلام کی تشہیر کی ذمہ داری بلا شرکت غیرے اسی نے سنبھالی ہوئی ہے۔ یہ اس کے کلام کو مرتب بھی کرتا ہے، اس کی یاد میں تقریبیں بھی منعقد کرواتا ہے اور اس نے اس کے نام پر ایک اکادمی بھی قائم کر رکھی ہے۔

وہ قلمکار ہے۔ اس نے ناول بھی لکھے ہیں۔ کہانیاں بھی تخلیق کی ہیں اور مضامین بھی۔ وہ ناکارہ مجہول اور خوابی فکر و فلسفہ کا معتاد نہیں، وہ شروع ہی سے زندہ معاصر فکری تحریکوں کا طالب علم رہا ہے۔ ہمہ گیر انسانی محبت اور عالمگیری امن کا خواہاں ہے۔ سماجی عدل و انصاف پر یقین رکھتا ہے اور استحصال جبر اور آمرانہ قوتوں کا مخالف ہے۔ بعض اوقات اس کا قلم کار جہاد میں بہت آگے نکل جاتا ہے۔ جس سے اُسے ناقابل تلافی نقصان پہنچتا ہے۔ لیکن وہ اپنا زخمی چہرہ نہ تو کسی سے چھپاتا ہے اور نہ ہی کسی سے رحم کا طلبگار ہوتا ہے۔ وہ اپنی نظریاتی ہٹ دھرمی کے باعث متعدد اداروں سے جبراً نکالا جا چکا ہے۔ لیکن اس کے مؤقف کے دائرے سے اُسے آج تک نہیں نکالا جا سکا وہ اندر سے بے شک ٹوٹ رہا ہو۔ باہر سے اٹوٹ ہی دکھائی دیتا ہے۔

وہ جو کچھ لکھتا ہے۔ اس میں ریاکاری کی بجائے صداقتِ احساس ہوتی ہے۔ لوگوں کی محرومیوں کا غم ہوتا ہے اور گردو پیش پر تنقید ہوتی ہے۔ وہ ارتقا اور انقلاب کے محاذ پر نوکِ قلم سے اپنے سپاہیانہ جوہر دکھاتا رہتا ہے اور میرا خیال ہے کہ پسپائی اختیار کرنا اس کی اُفتادِ طبع کے خلاف ہے۔

ظہیر کاشمیری

۴ مئی ۱۹۸۳ء

معبدوں کے چراغ گل کر دو
قلبِ انساں میں اندھیرا ہے

دوستو!

"شکست ساغر کیا ہے؟ اور جب یہ آپ کے ہاتھوں میں پہنچے گی تو اس کی شکل کیا ہوگی؟ میں اس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ لیکن میرے ذہن میں اس کا دھندلا سا خاکہ ضرور ہے اور جب میں نے ۱۹۸۲ء کے آخر میں اسے مکمل کیا تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں خود ایک وجودی واردات سے گذرا ہوں۔ وجودی واردات کی اصطلاح دانشور دوست جشو محمد حنیف کے ذریعے مجھ پر ظاہر ہوئی ہے اور ساغر کی ۸ ویں برسی کے بعد جب یہ کبھی کبھی ساغر کے پیچیدہ مسئلہ پر گفتگو کرتے تو ایک ایسا ساغر ابھر کر ہمارے سامنے آ جاتا جو طاقتور زمان کے ساتھ مکالمہ کرتا ہوا نظر آتا ہے۔

ایک ایسا مکالمہ جس میں پورا وجود ڈھل جاتا ہے۔ ساغر صدیقی جب تک زندہ رہا۔ "زمانے" نے اس سے آنکھ تک نہ ملائی۔ یا خود اس نے اپنے وجود کو زمانے کی آنکھوں سے چھپائے رکھا۔ یہ ایک الگ موضوع ہے اور اس ۸ ویں برسی جو ساغر کی دریافت" کے عمل میں ایک نیا موڑ ثابت ہوئی ہے اس کے وجودی اظہار کی معنویت پر غور کرنے کی دعوت دیتی ہے۔

لیکن یہ ایک طویل تجزیاتی" عمل ہے اور میں اپنے عجز کے سامنے بے بس ہوں سب سے پہلے یہ سوال دو طرح سے اٹھایا جا سکتا ہے کہ ساغر نے درماندگی کی زندگی کیوں اختیار کی؟ اس سوال کی پہلی صورت یہ ہے کہ کیا وہ اس تباہ حالی کے شعور سے ہی عاری ہو گیا تھا؟

اس سوال کے جواب کے لئے ہمیں ساغر کے نفسی اعمال اور خارجی حالات

کے درمیان ان گمشدہ کڑیوں کو تلاش کرنا ہوگا جو کسی فرد کی شخصیت کی تعمیر میں بنیادی کردار ادا کرتی ہیں۔

ساغر صدیقی ایک ایسے معاشرے میں پیدا ہوا تھا جہاں جاگیرداری نظام کی جڑیں ابھی بہت گہری ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ سرمایہ دارانہ معیشت بھی پروان چڑھ رہی ہے۔ جاگیرداری نظام میں فرد کی عزت کا معیار نسل اور خاندان ہے اور سرمایہ دارانہ طرزِ معیشت میں عزت و شرافت کا ضامن روپیہ ہے یہ دونوں معیار ساغر صدیقی کو حاصل نہ تھے اور ساغر کی زندگی اور فکر و فن کی تشکیل و ترتیب کا مطالعہ کرتے ہوئے ان دونوں عناصر کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

اس کے خطوطِ زندگی کو ترتیب دینے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ اس میں بے پناہ تخلیقی قوتیں تھیں اور وہ ان انسانوں کی صف میں نظر آتا ہے جو اپنی قوتِ فکر سے مکالمہ کرتے ہیں۔ وہ اپنے ارادے احساس اور عمل میں ذاتی تجربے کے حوالے سے پہچانے جاتے ہیں اور ان کا یہ تجربہ ہمہ گیریت میں ڈھل جاتا ہے۔

اس سماج میں جہاں عزت و شرافت کا معیار نسل خاندان یا روپیہ ہو اور یوں شخصی ذات کا عمل روک دیا گیا ہو اپنی ذات کے محور پر ساغر کی گردشوں کا تجربہ بڑا حیران کر دینے والا ہے اور اپنے وجود کے اظہار کے لیے اس کی مجاہدانہ کوشش اس کے تخلیقی عمل کو اتنا پُرکشش بنا دیتی ہے کہ اُسے ان ذیشان مفکروں، فنکاروں، اور تخلیق کاروں میں دیکھ کر الوہی مسرتوں کا احساس اور فروزاں ہو جاتا ہے۔ جو تخلیق کی بقا کے لیے اپنے وجود کو قربان کر دیتے ہیں۔

جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا ہے ساغر صدیقی سے محبتوں کے نئے نئے افق ظہور میں آ رہے ہیں۔ اس کے بارے میں دیو مالائی کہانیاں مشہور ہو رہی ہیں۔ موقع پرست اس سے وابستگی کے جھوٹے افسانے تراش کر اپنی سماجی حیثیت بنانے کے لیے

بھونڈے پن سے ہاتھ مار رہے ہیں۔ حالانکہ شعر و ادب، فلسفہ و فن اور تہذیب و ثقافت سے اُن کا دُور کا بھی واسطہ نہیں۔ ان کے بدتمیز ہاتھوں سے اس کی گدڑی کی آبرو لٹتے ہوئے دیکھ کر دُکھ بھی ہوتا ہے۔ لیکن میں اس بے رحم سماج میں تنہا کیا کر سکتا ہوں لیکن یہ جان کر ایک توانائی ملتی ہے کہ جہاں میں ابھی کچھ لوگ باقی ہیں۔ جو ساغر کی فنی عظمتوں اور شخصی خوبصورتی کی حفاظت اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ اس سے اپنے پیار کی چادر داغدار ہوتا نہیں دیکھنا چاہتے۔

میرے مخاطب بھی اہلِ درد اور راست باز ہیں اور میں انہیں یقین دلانا چاہتا ہوں کہ ساغر صدیقی کے بارے یہ کہانی دروغ گوئی کا شاہکار ہے کہ اپنی منگیتر سے شادی نہ ہونے پر اس نے جوگ لیا۔ وہ ان زمینی خواہشوں اور بندھنوں سے بہت پہلے آزاد ہو چکا تھا اور پھر اس کی کسی لڑکی سے منگنی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جبکہ وہ پیدائشی جبر کی وجہ سے کسی بھی خاندانی اکائی سے منسلک نہیں تھا۔ اور معمولی سی سوجھ بوجھ رکھنے والا شخص یہ اچھی طرح جانتا ہے کہ اس طبقاتی معاشرے میں کسی ایسے فرد کی منگنی کا تصور ہی غلط ہے۔ جو بے نشان پیدا ہوا ہو۔

ساغر صدیقی کے بارے میں یہ بے سروپا کہانی اِس کی انسانی احترام کے لیے جدوجہد کو کمتر اور اس کے تخلیقی مرتبے کو داغدار بناتی ہے کیونکہ ساغر کی زندگی کے کسی بھی حصے پر اس قسم کی بازاری رومانیت کا سایہ تک نہیں۔ اس کا محبوب انسان تھا اور اس کا عشق انسان کی ذات کی بحالی کے عمل سے تھا۔

ساغر اس انسان کش سماج میں انسان سے انسان کے پیار کا آرزو مند تھا۔ وہ ایک جوہرِ خاص تھا، انسان کی توہین اور بے چارگی پر تڑپ اُٹھتا تھا۔ اس کی زندگی کا ہر پل اس کی ذہنی پاکیزگی اور فکری روحانیت کا گواہ ہے۔ وہ ذاتی دُکھوں کی جلتی ہوئی گذرگاہوں پر اجتماعی دُکھوں کا نمائندہ تھا۔ وہ سماجی اونچ نیچ

اور ہر ترم کے استحصال کے مارے ہوئے تباہ حال لوگوں کی نجات کا دیوانہ تھا۔ وہ ان کی تباہی پر نوحہ گری کی بجائے ان میں زندگی کے شعور کی جوت جگانے کی بے پناہ تڑپ رکھتا تھا۔

اس کے پاس صرف شعور کا ہتھیار تھا۔ جس سے نہ صرف اس نے اپنی ذات کا دفاع کیا بلکہ فکری گمراہی کے خلاف جہد آزما رہا۔ معاشرتی رشتوں کے کھوکھلے پن اور سماجی لوٹ کھسوٹ کے مشاہدے نے اُسے بہت رُلایا تھا۔ لیکن وہ اپنے ادراکی جوہر کے حوالے سے اپنے ارادے، احساس اور عمل میں بڑا مضبوط تھا۔ اس نے انسانوں کی اس جدید غلامی کے خلاف پوری توانائی سے آواز بلند کی۔ جو انسانوں سے جوہرِ انسانی چھین لیتی ہے اور انسان داخلی اور خارجی سطح پر سناٹوں میں گم ہو جاتے ہیں۔

ساغر نے ان سناٹوں کو چیرنے کے لیے فکری صداقتوں کے جو سورج طلوع کئے وُہ بنی نوعِ انسانوں سے اس کی بے داغ محبتوں کے امین ہیں۔ اس کی شعری تخلیقات سماجی اور کائناتی تجربوں کا عکس ہیں وُہ اس فرسودہ اور بے معنی سماج میں زندگی کے نئے نغموں کا آہنگ تھا۔ جس سے فرد میں شخصی ذات کا شعور جنم لیتا ہے۔

دوستو!

میں نے ساغر کی زندگی کو ترتیب دینے کے لئے برسوں آرزو کی ہے اور شکستِ ساغر کے عنوان سے ساغر کی زندگی کے نقوش مرتب کرتے ہوئے محض اپنی یادوں پر ہی انحصار نہیں کیا بلکہ ان بکھرے بکھرے واقعات کی بھی چھان بین کی ہے۔ جو دوسروں کی زبانی معلوم ہو سکے ہیں۔ میں اپنے اس عمل کو کسی تخلیقی تجربے کا نام تو نہیں دے سکتا۔ لیکن عصری صداقتوں اور کسی خاص وجود کی شناخت کے ان اصولوں سے انحراف نہیں کرسکتا جن کا تعلق جدلیاتی عمل سے ہے۔ کسی شخصیت

کی نشوونما اور ذہن کی تکمیل میں خارجی حالات کی اثر پذیری کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ساغر ایک بدلتے ہوئے دَور میں پیدا ہوا تھا۔ اس کے سامنے برصغیر میں سیاسی تبدیلیاں رونما ہوئی تھیں۔ اور اس نے زمین سے انسان کو چاند پر اُترتے بھی دیکھا تھا۔ ماضی کی روایات پر بھی اس کی نظر تھی۔ اور وہ ظاہری گمشدگی کے باوجود اپنے ذہن کی بیداری میں مکمل ہوش مند تھا۔

اس کی زندگی کے صبح و شام غور و فکر کی کہکشاؤں میں گزرتے تھے اور خود اختیاری مدہوشی میں وہ پورے نظامِ ہستی سے وابستہ ہوتا تھا۔ اگرچہ اپنے ظاہری حال سے اس کی بے خبری کی داستان بڑی طویل ہے لیکن باطنی طور پر وہ بے حد منظم تھا۔ اور اول و آخر ایک جری انسان کی طرح سانس لیتا ہوا نظر آتا ہے میں نے شکستِ ساغر لکھتے ہوئے کسی تکنیک کو مدِنظر نہیں رکھا۔ اس کی ذات کے حوالے سے واقعات اور حالات کو سیدھے سادھے انداز میں لکھتا گیا ہوں۔ میں اُسے فوق الانسان ثابت نہیں کرنا چاہتا۔ اور نہ ہی میرا یہ نظریہ ہے

ایک مکروہ سماج میں ساغر ایسے نابغۂ روزگار افراد کے ساتھ جو سلوک ہوتا ہے اور غریب کو جس سچائی کے ساتھ وہ محسوس کرتے ہیں، یہ دونوں حقیقتیں ان کو ملامتی روپ اختیار کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک عزت کا معیار وہ نہیں ہوتا جنہیں رائج الوقت سماجی اقدار متعین کرتی ہیں۔

ساغر صدیقی ایک لوک شاعر تھا۔ ایک لوک شاعر سے بڑھ کر ایک انسان دوست مفکر تھا۔ اور ذلت و رسوائی کو گلے لگا کر جیا۔ اس کا حوصلہ کوئی کم ظرف نہیں کر سکتا۔

یونس ادیب

۲۶ جنوری ۱۹۸۳ء لاہور

جنوں کے تجربوں کی نگہداری
بہ انداز فراست کر رہے ہیں۔

موری دروازہ کے باہر جہاں کبھی گلاب کھلتے تھے۔ اور شہتوت کے درختوں کی گود میں کھلے برآمدوں اور گول چھت والا جو ایک ریڈنگ روم ہوتا تھا۔ ساغر صدیقی کی زندگی میں اس کا کردار بڑا قیمتی ہے۔ میں کبھی کبھی اس کے سامنے سے گزرتا ہوں تو ساغر صدیقی اچانک مجھے مل جاتا ہے۔ باتیں کرتا ہوا باغ میں دور تک میرے ساتھ چلتا ہے اور جب میں لاہوری دروازہ کی پر ہجوم ٹریفک کے علاقے میں آ جاتا ہوں تو وہ اس طرح بچھڑ جاتا ہے۔ جیسے پہلے کی طرح پھر کبھی مل جائے گا۔ لیکن ساغر تو منوں مٹی کے نیچے ابدی نیند سو رہا ہے۔ وہ اب کہاں ملے گا؟

میں اس کے بارے میں اپنی یادوں کو ترتیب دیتے ہوئے اس ریڈنگ روم کو فراموش نہیں کر سکتا۔ جہاں وہ برسوں پہلے اپنی ذات کی طویل گمشدگی کے بعد اچانک آ گیا تھا۔ اور میں نے اس ساغر کو بہت قریب سے دیکھنا شروع کر دیا۔ جو اپنی گمشدگی کے جانگسل تجربے کی سولی سے اتر کر فکری شعور کی بلندیوں و وسعتوں میں فاتحانہ انداز سے داخل ہو رہا تھا۔ حالانکہ وہ سنگین تر غربت و افلاس اور سنگین تر حالات کے استبداد کا شکار تھا۔ لیکن ذہن کی پوری توانائیوں کے ساتھ معاشرے میں حسن و خیر کی فراوانی دیکھنے کا آرزومند تھا۔ اور انسان کے روشن مستقبل کے خوابوں سے سرشار تھا۔

ریڈنگ روم سے مجھے شفاف پانیوں والی وہ نہر یاد آ گئی ہے جس کے آس پاس گھنے سایہ دار درخت تھے۔ ریڈنگ روم اور سرکلر روڈ کے درمیان ایک نو مین لینڈ تھی۔ اور خاردار تاروں کی باڑ کے پار نو مین لینڈ پر مزدوروں، گداگروں اور بے گھر لوگوں کی ایک ننھی منی بستی آباد تھی۔ ان کے قریب ہی روس یا چینی ترکستان کے

تارکین چوکور جھونپڑیوں میں رہتے تھے۔ اور گرم ٹوپیاں بنا کر مہر سیا کے ہوٹل رحمت کدہ کے باہر فروخت کرتے تھے۔ ان کی جھونپڑیوں سے دور گندے پانی کا نالہ تھا جو آگے جا کر مڑتے ہوئے ریڈنگ روم کے باغ اور باؤلی کے درمیان حائل ہو جاتا تھا۔ جس پر ۱۹۴۷ء کے بعد شیشو پہلوان نے قبضہ کر رکھا تھا۔ جہاں صبح و شام لوگ ورزش کرتے تھے۔ چوپٹ کھیلتے تھے اور دھواں اڑاتے تھے۔

باؤلی سے ملحقہ ایک منزلہ عمارت کے کمروں میں بسم اللہ ہوٹل۔ ٹوٹی ہوئی ہڈیاں جوڑنے والے بوڑھے پہلوان کا ہسپتال اور نجومیوں کی رصدگاہیں کھل گئیں تھیں۔ چھت پر جانے والی سیڑھیوں میں ایک لنگڑا فقیر رہتا تھا اور اس کے پیچھے ایک ویران گلی تھی۔ جس میں کالی سیاہ رنگت والا نابینا مالشیا رہتا تھا۔

برسوں پہلے جب میں صبح ہی صبح اندرون شہر کی گلیوں سے ہوتا ہوا [illegible] کے پیچھے سے باغ میں داخل ہوتا تو سب سے پہلے باؤلی کی شہ نشین پر بیٹھا ہوا شیشو پہلوان نظر آتا اور وہ البتہ جب کے لوگوں کے لہجے میں حال دریافت کرتا۔ پھر بسم اللہ ہوٹل، ٹوٹے ہوئے جوڑوں کے ہسپتال اور نجومی کی دکان کے سامنے گزر کر ریڈنگ روم کے باغ میں قدم رکھتے ہی سب سے پہلے گلاب کے پودوں کے چکر لگاتا اور پھر ریڈنگ روم کے انچارج حیدر علی کے پاس پہنچ کر رک جاتا۔ حیدر علی میرا بچپن کا دوست تھا۔

ریڈنگ روم میں ہر اتوار کو مجلس اردو کے تنقیدی اجلاس ہوتے تھے۔ آس پاس کے نوجوان ادیب و شاعر اور مضمون نگار بڑی باقاعدگی سے وہاں آتے تھے اور کبھی کبھی خالد شفیق کسی بڑے نامور ادیب کو بھی وہاں کھینچ لاتا تھا۔ ادبی سرگرمیوں کی وجہ سے یہ ریڈنگ روم تمام ساتھیوں کا میٹنگ پوائنٹ بن گیا تھا۔ اور اس حوالے سے ہم سارا سارا دن ریڈنگ کے آس پاس منڈلاتے رہتے

گلابوں کے پاس بیٹھ جاتے ریڈنگ روم میں اخبار پڑھتے اور جب ریڈنگ روم بند ہو جاتا تو ہم بھی سیڑھیوں والی کوٹھڑی میں نشست جماتے جو ریڈنگ روم کے انچارج حیدر کی مستقل رہائش تھی۔

ریڈنگ روم اور اس کے آس پاس پھیلی ہوئی ایک سی زندگی بعض اوقات ٹھہری ہوئی اور جامد و ساکت نظر آنے لگتی تھی۔ باغ کے اندرونی سڑک کے کنارے نجومیوں کے ڈیرے بھکاری بائیوں میں اسلامی تاریخی ناول سننے والے بوڑھے۔ ملنگ لٹے ہوئے بے گھر لوگ، مالشیئے اور شہر کی فصیل کے پہلو میں بہنے والی بدرو کے کنارے گندگی کے ڈھیروں سے ہڈیاں لوہا لکڑی اور دوسری چیزیں اکٹھی کرنے والے لوگ اور کتے۔ ایک نہ ختم ہونے والا منظر کا حصہ جو بہت دھیرے دھیرے رینگ رہا تھا۔

میں ریڈنگ روم کی چھت سے کالے سیاہ بدن والے نابینا مالشیئے کو کسی گورے بدن کے پہلوان کی مالش کرتے ہوئے دیکھ کر پیچھے مڑتا تو خاردار تاروں کے پار ٹوٹے، لنگڑے۔ اندھے اور کوڑھ زدہ بھکاریوں کا منظر ابھر آتا۔ میں بے چین ہو کر حیدر کو آوازیں دینے لگتا۔ حیدر، حیدر، یار حیدر! کیا اعجاز نہیں آیا؟ حیدر نیچے سے کوئی جواب نہ دیتا۔ اعجاز کے حوالے سے میرا دھیان راجن اور احمد نثار کی طرف چلا جاتا۔ راجن رام گلی سے روزانہ ریڈنگ روم میں آتے ہوئے راستے میں لوہاری کے اڈے سے اعجاز کو بھی ساتھ لے آتا تھا۔ احمد نثار کے آنے کا کوئی وقت نہیں۔ اگر اس کا بسوں کے اڈے پر جانے کو دل نہ چاہتا تو سب سے پہلے حیدر کی کوٹھڑی میں موجود ہوتا۔ فاروق عادل بھی گوالمنڈی سے اپنے افسانے لے کر آ جاتا۔ اکثر اوقات شام سے پہلے اکرام لدھیانوی قمر تسکین اور نور بھنبوری بھی باغ کے ایک الگ تھلگ کونے میں باتیں کرتے ہوئے

نظر آ جاتے۔

میں اس زمانے کو یاد کرتا ہوں تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہم اس ریڈنگ روم کے اسیر ہو کر رہ گئے تھے۔ یا کچھ پُراسرار طاقتوں نے ہمیں وہاں نظربند کر رکھا تھا۔ ریڈنگ روم ہمارے پیروں کی زنجیر بن کر رہ گیا تھا اور یاد نہیں ہم کیسے کیسے خوابوں اور خیالوں کی جنتیں تعمیر کرتے تھے فاروق کبھی کبھی آکر کہتا۔ "یوں لگتا جیسے ہم سب یہاں آکر رک گئے ہیں اور کسی ایسے دھارے کے منتظر ہیں جو ہمیں ریڈنگ روم کی زندگی کے گرداب سے باہر نکال دے۔"

ہم سب بیکار تھے ریڈنگ روم ہمارے لیے ایک بہت بڑی پناہ گاہ تھی اور اندھیرا ہوتے ہی ہم اس پناہ گاہ سے باہر نکل کر اپنے اپنے گھروں کی طرف جانے لگتے تو حیدر کوٹھڑی میں بند ہو جاتا۔ باغ پر خاموش اندھیرا اپنی چادر تان دیتا۔ چینی نژاد ٹوپیاں بنانے والوں کی جھونپڑیوں سے صرف بچوں کے رونے کی آوازیں آتیں۔ پھر مزدوروں کی کھانسی بھی نیند ان ہونے لگتی۔ ہم ایک دوسرے سے کوئی بات نہ کرتے اور لوہاری چوک میں آکر جدا ہونے لگتے تو ایک جیسی زمین۔ ایک جیسے لوگ، ایک جیسی باتیں، اور ایک جیسے چہرے، ویرانی بھوک۔ بیکاری اور کرب کے سائے جن کا پھیلاؤ شہر کے دوسرے حصوں میں بھی ہمارا تعاقب جاری رکھتا تھا۔ ریڈنگ روم سے ہی شروع ہوتا تھا۔ اور ریڈنگ روم پر ہی ختم ہوتا تھا۔ زندگی الجبرے اور جیومیٹری کا ایک پیچیدہ سوال نظر آتی تھی۔

اعجاز کا سب سے بڑا مسئلہ شاعری تھا۔ احمد نثار اپنی گنٹھیا زدہ ماں اور چھوٹے چھوٹے بہن بھائیوں کی کفالت کے لیے رسوا کن حد تک محنت کرنے پر تیار تھا۔ راجن اپنے گھر والوں کی مرضی کی زندگی بسر کرنے سے انکار کر چکا تھا۔ حیدر کو فلسفے کی کتابیں کاپیوں پر نقل کرنے کا جنون تھا۔ اور جب بہت

اکتا جاتا تو احمد نثار کے ساتھ موری دروازہ کے اندر آکر لائبریری کھولنے کے پلان بنانے لگتا۔ میرا سب سے بڑا مسئلہ ایسے دانشور گروہ کی تلاش سے وابستہ تھا۔ جو مجھے کہہ سکے کم از کم اتنا بتا دے کہ زندگی کا راستہ اتنا الجھا ہوا کیوں ہے اور ہمارا رزق کس نے بند کر رکھا ہے؟ میں برطانوی فرم میں ملازمت سے محرومی کے بعد یکے بعد دیگرے کئی ملازمتوں سے محروم ہو چکا تھا اور فیصلہ کر رہا تھا کہ اب میں کبھی ملازمت ہی نہیں کروں گا! اور صرف لکھا کروں گا۔ افسانے، ناول، کہانیاں اور نظمیں لیکن افسانے، ناول اور کہانیوں کے بارے میں سوچتے سوچتے معاشی تقاضے جان لیوا ہو جاتے تو میں شہر سے گھبرا کر ریڈنگ روم میں آ جاتا۔

وقت تیزی سے بیت رہا تھا۔ لیکن ریڈنگ روم کے آس پاس گزرنے والی سردیوں اور گرمیوں کے سارے منظر ایک جیسے تھے۔ کبھی باغوں میں گلاب کھل اٹھتے۔ کبھی شہتوت کے پتے جھڑ جاتے۔ جامن کی ٹہنیاں ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگتیں اور کبھی چنار کے درختوں پر سرخ پھول مسکرانے لگتے۔ کبھی گزرا ہوا وقت یاد آنے لگتا اور کبھی آنے والے دنوں کا خوف ڈرانے لگتا۔ گرمیوں کی ایک دوپہر کو راجن نے بتایا کہ اُسے بادامی باغ کی ایک فیکٹری میں ملازمت مل گئی ہے دوسرے دن معلوم ہوا اعجاز کو عدم صاحب نے ایک ہفت روزہ میں ملازم کرا دیا ہے۔ کچھ دنوں بعد قمر تسکین اور اکرام لدھیانوی، موری گیٹ کے باغ کو چھوڑ کر گول باغ میں جانے لگے۔ احمد نثار کی ماں زیادہ بیمار ہو گئی۔ تو وہ زیادہ وقت لبسل کے اڈے پر گزارنے لگا۔

میں ریڈنگ روم کی چھت پر تنہا رہ گیا تھا۔ اور اب شام کے وقت ہی اعجاز اور احمد نثار سے ملاقات ہوتی تھی۔ کرخت تنہائیوں اور جامد و ساکت سوچوں کی دیواروں میں میرا وجود چنا جانے لگا۔ تو مجھے ریڈنگ روم کی طرف

آنے والے راستوں پہ کانٹے اُگے ہوئے دکھائی دینے لگے لیکن میں پھر بھی ان کانٹوں پر چل کر یہاں آ جاتا۔ حیدر مقررہ وقت پہ ریڈنگ روم کھول کر کوٹھڑی میں بند ہو جاتا اور میں نے چھت پر بیٹھ کر اپنا پہلا ناول اندھیری رات کے مسافر لکھنا شروع کر دیا۔

میرے ناول کا آخری باب ابھی نامکمل تھا کہ گرمیاں بیت گئیں اور سردیوں کا موسم شروع ہو گیا۔ پھر ایسا ہوا کہ دوپہر کے بعد راجن اعجاز اور احمد نثار نے بھی آنا شروع کر دیا ہم باغ میں بیٹھ جاتے یا چھت پہ چلے جاتے اور شام ہوتے ہی حیدر کی کوٹھڑی میں پناہ گزیں ہو جاتے ایک دوپہر جب دھوپ بڑی تیز تھی۔ اچانک لمبے سیاہ بالوں والا لرزاں و ترساں ساغر صدیقی کندھے پہ گدڑی ڈالے جھومتا ہوا باغ میں داخل ہوا۔ اس کے چہرے پہ جلی ہوئی راکھ کی تہیں جمی ہوئی تھیں۔ اور اس کی آنکھوں میں بڑی پُرروشن روشنی اتر رہی تھی۔ اس نے اپنے نحیف و نزار جسم کو سیاہ چادر میں لپیٹا ہوا تھا اور اس کے زخمی کھردرے اور میلے چیکٹ پیروں کو دیکھ کر یوں لگتا تھا۔ جیسے یہ شخص صدیوں کی مسافت طے کر کے یہاں آیا ہے۔ ہم سب حیرت زدہ تھے اور جونہی وہ قریب آیا ہم اٹھ کھڑے ہوئے۔ پھر اس نے مجھ سے آنکھیں ملائیں اور گدڑی بچھا کر بولا "میں کوئی مقدس آدمی نہیں ہوں بیٹھ جاؤ بابا" تو وہ ہمارے درمیان پیروں کے بل بیٹھا تھا اور حیران آنکھوں سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ اس کا وہ تابناک چہرہ بار بار اس کے دھندلائے ہوئے چہرے سے باہر نکل آتا تھا۔ جسے اس شہر میں ہم نے برسوں پہلے دیکھا تھا۔ پہچانا تھا۔ اور سمجھا تھا۔ لیکن اب وہ تابناک چہرہ زندگی کرنے کے تجربوں کی گرد میں چھپ گیا تھا اور وہ چہرہ سامنے آ گیا تھا جو اپنے اندر کی اندھی مسافتوں سے کملایا ہوا تھا۔

ہم سب چپ تھے وہ بڑی بے نیازی سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ اور ٹھہر ٹھہر کر

کہہ رہا تھا "ہاں ، یہاں تو کچھ بھی تبدیلی نہیں ہوئی ۔ سب کچھ ویسے کا ویسے ہی ہے "

"وہی حیدر بابا ہے ۔ وہی پیلی گول عمارت ہے ۔ وہی باغ ہے ۔ وہی لوگ ہیں ۔ وہی رُت ہے ۔ وہی موسم ہے "

ہاں میں سب کچھ دیکھ رہا ہوں وہ اچانک ہماری طرف مڑا اور بولا ۔ تم بھی کچھ لکھ لو ۔ اگر یہ فضا کچھ نہیں کہتی ۔

کیا تو نہیں " ساغر بابا ۔ حیدر نے سر جھکا کر کہا اور گھاس کا تنکا دانتوں میں لے کر دبانے لگا ۔

وہ ساغر صدیقی اچانک ہمارے سامنے آ گیا تھا ۔ جو چند سال پہلے چلتے چلتے اس شہر میں کھو گیا تھا اور ریڈنگ روم کے باغ میں ہمارے سامنے اس طرح آموجود ہوا تھا جیسے خواب میں دکھائی دے رہا ہو ۔

حیدر علی جلدی سے اٹھا نسم اللہ ہوٹل میں چائے کے لیے چلا گیا ۔ اعجاز نے گولڈ فلیک کی ڈبیا کھول کر گھاس پر رکھ دی اور ساغر نے جلدی سے اپنی پوٹلی کھول اور گولڈ فلیک کی بسنتی رنگ کی ڈبیا نکال کر بولا ۔ میں بھی گولڈ فلیک پیتا ہوں پاسنگ چھوڑ دیا ہے اور پھر اعجاز کی طرف منہ کر کے کہنے لگا ۔ سید زادے معلوم ہوتا ہے تمہیں کہیں ملازمت مل گئی ہے سناؤ ، تعلیم کی کونسی منزل طے کی ہے ؟ اور پھر میری طرف رُخ کر کے اس نے کہا ۔ کیا کوئی کتاب لکھی ہے ۔ ؟ مگر تم کہاں غائب ہو گئے تھے ۔

میرے سوال کو اس نے کوئی اہمیت نہ دی اور جب حیدر چائے لے کر آ گیا ۔ تو ساغر نے حیدر سے کہا ۔ حیدر بابا ، فقیر کو کچھ دن تمہارے ہاں قیام کرنے کی اجازت درکار ہے فقیر کچھ تبدیلی چاہتا ہے ۔ حیدر نے جواب دیا اجازت کی کیا ضرورت ہے ۔ قیام ہی قیام ہے ۔

میں چاہتا تھا کہ ساغر سے پوچھوں کہ وہ اتنا عرصہ کہاں غائب رہا ہے ۔ لیکن اعجاز نے سوال کر دیا آپ کچھ لکھ رہے ہیں ، ساغر صاحب بہت دن ہو گئے آپ سے تازہ کلام نہیں سُنا ،

شعر ہی میری کائنات ہے ۔ لیکن اس وقت نہیں پھر کبھی سنائیں گے ۔ تم سناؤ کیا حال ہے اس شہر کا ۔ فقیر تو صدیوں بعد ہوش میں آیا ہے سب کچھ چھن گیا ہے لیکن ذہن سلامت ہے

کیا آپ اس شہر میں تھے ۔ حیدر نے پوچھا

وہ شہر میں تھا لیکن اس کی خبر رکھنا مشکل ہو گیا تھا ۔ ساغر نے جواب دیا ۔ اور پھر کہنے لگا حیدر بابا ! بہت تھکا ہوا ہوں آرام کروں گا ۔ ذرا کوٹھڑی تک چھوڑ آؤ ۔

ساغر واقعی بہت تھکا تھکا دکھائی دیتا تھا ۔ اس نے اپنی گٹھڑی اور پوٹلی اٹھائی اور یہ کہتے ہوئے کوٹھڑی کی طرف چل پڑا " خیر ہو پھر ملیں گے بڑی باتیں کرنی ہوں گی بہت کچھ کہنا ہے بہت کچھ سُننا ہے "

ساغر کوٹھڑی میں بند ہو گیا اور ہم باغ سے نکل کر لوہاری چوک میں آئے تو شام گہری ہو چکی تھی ۔ اعجاز اپنی گلی کی طرف چلا گیا ۔ راجن باغ کے اندر ہی اندر چلتا ہوا رام گلی کی طرف روانہ ہو گیا ۔ اور میں اندرون شہر کی پراسرار گلیوں اور بازاروں سے گزرتا ہوا گھر کی طرف جا رہا تھا ۔ تو ساغر میرے ذہن میں ایک سوالیہ نشان بن کر بار بار ابھر رہا تھا ۔ پاکستان بننے سے پہلے اور پاکستان بننے کے بعد ملنے والے ساغر کی ان گنت صورتیں ۔ میرے ذہن میں مشق ابھرتی رہیں ۔

ریڈنگ روم میں ساغر صدیقی کے آجانے سے بڑی انوکھی تبدیلی پیدا ہو گئی تھی ۔ اب ریڈنگ روم کی طرف جاتے ہوئے ساغر سے ملاقات کی خواہش بڑی جاذبی لگتی تھی ۔ لیکن کبھی کبھی وہ میرے جانے سے پہلے ہی طالب چشتی کے ساتھ

شہر میں نکل جاتا اور صرف شام کے بعد ہی حیدر کی کوٹھڑی میں اس سے ملاقات ہوتی۔ جہاں اعجاز، احمد نثار اور دوسرے کئی دوست آ جاتے۔ شبیر بجلی والا بھی روزانہ ہی پلاس اور پیچ کس تھامے آ جاتا۔ سگریٹوں کے دھوئیں سے سید حیدر کی کوٹھڑی کی فضا بوجھل ہو جاتی لیکن ساغر کی باتوں کی شمعوں کی روشنی اتنی دلآویز ہوتی کہ ہم رات گئے تک ساغر کے ساتھ گردش میں رہتے۔

ساغر اُن دِنوں اپنے حسی تجربوں کا بڑے فنکارانہ انداز میں اظہار کر رہا تھا اور اپنی گمشدگی کے جن مرحلوں گزرا تھا۔ اُن کے اثرات اس کے وجود پر بڑے نمایاں نظر آتے تھے۔ لیکن شعورِ زندگی کا ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر تھا۔ اور یوں لگتا تھا۔ جیسے وہ حقائق کا براہِ راست مشاہدہ کر رہا ہو۔ اور اس کا شعور ان مشاہدات تجربات کو فنی روپ دینے میں جولانیوں پر ہے کبھی کبھی اتنے گہرے ملال کی زد میں بھی آ جاتا کہ زندگی کے سارے دُکھ اس کی آنکھوں میں سمٹ آتے۔ لفظ ہونٹوں کے پیچھے ہی رہ جاتے اور اس کے خاکستری چہرے پر درد کی تحریریں روشن ہو جاتیں۔

گرمیوں کی ایک شام کو ریڈنگ روم کی عقبی سیڑھیوں میں محفل جمی ہوئی تھی، اعجاز ٹالسٹائی کے ناول کا ایک باب پڑھ رہا تھا، ساغر ڈوروں والی آنکھوں میں افسردگی چھپائے پاس ہی بیٹھا تھا، احمد نثار اور میں ناول کے باب میں کھوئے ہوئے تھے، اعجاز نے ایک پیرا پڑھ کر کتاب بند کی تو ساغر ایک دم چونک پڑا اور ہاتھ کا اشارہ کر کے بولا ——— پھر پڑھنا شروع کر دے!

اعجاز نے دوبارہ پڑھنا شروع کر دیا ——— "جس طرح

انہوں نے حضرت عیسیٰ کو مصلوب کیا تھا۔ وہ اسی طرح مجھے سولی پر چڑھانا چاہتے ہیں، مجھے جکڑ کر عدالتوں میں لے جاتے ہیں، ایک بار انہوں نے مجھے پاگل خانے پہنچا دیا تھا۔ مگر وہ کچھ نہیں کر سکتے کیونکہ میں آزاد ہوں۔ وہ سمجھتے ہیں میں خود کو کس نام سے پکاروں۔ مگر میرا کوئی نام نہیں، میں سب کچھ ترک کر چکا ہوں۔ میرا کوئی گھر نہیں۔ کوئی وطن نہیں۔ میں صرف میں ہوں۔ وہ پوچھتے ہیں کیا نام ہے تمہارا ——— ؟ میں جواب دیتا ہوں۔ انسان ——— ! تمہاری عمر کیا ہے ——— ؟ میں کہتا ہوں پتہ نہیں۔ میں برسوں کو شمار نہیں کر سکتا۔ میں ہمیشہ تھا اور ہمیشہ رہوں گا ——— وہ پوچھتے ہیں ——— تمہارے ماں باپ کون ہیں ——— ؟ میرا جواب ہے مگر میرا کوئی نہیں، زمین میری ماں ہے اور آسمان میرا باپ ہے۔"

اعجاز آگے پڑھنے لگا تو ساغر نے کہا! بس کرو ——— اعجاز نے کتاب بند کر دی۔ تھوڑی دیر بعد ساغر اُٹھا، اُس نے اپنی پوٹلی اٹھائی اور بغیر کچھ کہے کوٹھڑی سے باہر نکل گیا۔

ایک دن وہ باغ میں داخل ہوا تو بے حد اداس اور مغموم تھا۔ اس نے کسی سے کوئی بات نہ کی اور چپ چاپ کوٹھڑی کی طرف روانہ ہو گیا۔ دو دن تک اس نے سناٹے میں گزارے اور جب اس سناٹے کا کرب کم ہوا تو اس نے بتایا ——— میں رام گلی سے گزر رہا تھا۔ کہ میرے جسم پر کالی چادر دیکھ کر گلی کے بچوں نے شور مچانا شروع کر دیا۔ چادر والی مائی۔ چادر والی مائی۔ وہ شور مچاتے مچاتے دور تک میرے پیچھے آئے اور میں بھاگ کر ایک تنور میں پناہ گزیں ہو گیا۔"

بچوں کے اس واقعے سے ساغر بہت دنوں تک دِگرگوں رہا اور کبھی چلتے چلتے کوئی شور سنائی دیتا تو گھبرا کر پیچھے دیکھنے لگتا۔

ریڈنگ رُوم کے آس پاس پھر موسم بدل گیا تھا۔ درختوں پہ دو دل اداس جھاڑیوں سے پتے جھڑنے لگے تھے۔ باغ میں بیٹھنے والوں کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔ اور ہم ساغر کے ساتھ کسی درخت کے نیچے دھوپ میں بیٹھے ہوتے تو وہ اپنے وجود اور کائنات کے حوالے سے بعض اوقات بڑی فلسفیانہ باتیں کرنے لگتا۔ وہ میں اور یہ کائنات ایک چیز ہیں یہ راز میں نے ستاروں سے چرایا ہے۔ یہ وجود جل رہا ہے۔ سب وجود جل رہے ہیں سُلگ رہے ہیں۔ میری آنکھوں نے کبھی کوئی مسکراہٹ کھِلی ہوئی نہیں دیکھی اور سوچتے ہیں یہ بات ہے کہ زندگی زندان کی کوئی کڑی ہے تو اس کو ٹوٹنا ہوگا۔

ساغر درحقیقت اپنی ذات کے حوالے سے دکھ کے سارے رشتوں کو پہچان چکا تھا اور اپنے احساسات کو بڑی جانسوزی سے شعروں میں ڈھال رہا تھا۔ اگرچہ ہم اس وقت اس کے اندر کے تجربے سے ناواقف تھے۔ لیکن اس کے بعض شعروں اور بے ربط جملوں سے اتنا اندازہ ضرور ہوتا تھا کہ وہ اپنے کسی مخفی تجربے کے اظہار کے لیے بے چین اور اس نے جو کچھ اپنے حواس میں محفوظ کیا ہے۔ اس پر مطمئن ہی نہیں بلکہ اس کی صداقت کی گواہی بھی دینے کے لیے تیار ہے اس کا وہ مخفی تجربہ کس نوعیت کا تھا؟ اس وقت ہم اس کی شناخت کرنے سے معذور تھے لیکن اس کی ذات میں جو نئی کشش پیدا ہو گئی تھی وہ بڑی دلآویز تھی اور اگر وہ کہیں چلا جاتا تو ہم دن میں کئی بار اُسے دیکھنے کے لیے ریڈنگ روم کا چکر لگاتے جونہی وہ باغ میں نظر آتا۔ ہم کھنچ کر اس کی طرف چلے جاتے۔

اس کے وجود سے ایک عجیب سی شفقت اور پیار چھلکتا تھا اور اس کی باتوں سے بڑے بڑے گہرے معنی موتیوں کی طرح اچھل کر باہر آ جاتے تھے۔

لیکن اس کے رہن سہن میں بے نیازی بڑھتی جا رہی تھی۔ باہر کی دنیا اس کے رسم و رواج اور سماجی و معاشرتی ضابطے اس کے لیے بے معنی ہو کر رہ گئے تھے اس کے بال جٹا دھاری سادھوؤں کی طرح اس کے کندھوں گردن اور چہرے پر جھولتے رہتے تھے۔ اسے کئی کئی مہینے شیو کروانے کا خیال تک نہ آتا۔ لیکن دوسرے تیسرے دن خود ہی کہیں چلا جاتا۔ اور واپس آتا تو اس کی کالی چادر دُھلی دُھلائی دکھائی دیتی۔ وہ کون سی تلخ حقیقت تھی جس نے ساغر کو اپنے ظاہری وجود کی حفاظت سے بے نیاز بنا دیا تھا؟ اس سوال کا جواب اس کی اس وقت کی شاعری میں واضح طور پر نظر آتا ہے جو سلگتے جذبوں نا آسودہ گلیوں چکنا چور خوابوں، اور گمشدہ منزلوں کا ایک دل گداز ایکسپریشن تھی۔ جس میں ایک عام انسان کا المیہ اس کے فکر و فن کی اساس نظر آتا تھا۔

اس کے ذاتی احساسات میں ایک روحانی گداز کا رچاؤ بڑا اثر انگیز تضاد جیسے جاگتے اور محسوس ہونے والے دکھوں کی جانی پہچانی تصویر نظر آتا تھا اور اب جبکہ میں ریڈنگ روم کے حوالے سے ساغر صدیقی کو وجودی واردات کے تناظر میں دیکھتا ہوں تو یہ انکشاف حیرت زدہ کر دیتا ہے کہ اپنے وجود کی پہچان کے عمل میں اُسے تضادات نے جہاں جہاں چونکایا وہ حیرانیوں میں ڈوبتا چلا گیا اور نظامِ شمسی میں اپنے وجود کے مشاہدے سے انسان اور کائنات کے درمیان موجود رشتوں کے شعور اور گرد و پیش میں چلتے پھرتے انسانوں میں شدید اکلاپے کے احساس نے ساری منزلیں اور سارے راستے اس طرح تبدیل کر دیے کہ وہ زندگی سے براہِ راست اکتسابِ علم کرنے کے تجربے کی بھٹی میں عاشقانہ انداز میں کود پڑا۔

جس عہد میں لٹ جائے فقیروں کی کمائی
اس عہد کے سلطان سے کچھ بھول ہوئی ہے

ریڈنگ رُوم میں قیام کے دوران ساغر اپنے ذہنی ارتقاء کے عروج پر تھا۔ اس کی شاعری میں اپنے زمانے کے تضادات نمایاں ہوتے چلے جا رہے تھے اور وُہ پورے فنی شعور کے ساتھ اپنا تخلیقی فرض ادا کر رہا تھا۔ وہ اپنی ذات کو لالچ الوقت سماجی، معاشرتی اور عمرانی اصولوں سے الگ کرتا جا رہا تھا اور عام لوگ اسے ایک درویش اور تارک الدنیا انسان سمجھنے لگے تھے لیکن وہ اس کے حوالے سے درویشی کے مفہوم سے نا آشنا تھے۔

وہ اپنے سیاہ لباس کو لباسِ غم کے نام سے پکارتا تھا۔ لالچ طمع، کمینگی اور منافقت سے بھری ہوئی سوسائٹی میں اس کے لیے سانس لینا مشکل تھا، اور وہ اس جہان میں انسانوں کے لیے ایک ایسی جنت دیکھنے کا متمنی تھا جہاں کوئی دُکھ نہ ہو۔ وہ زندگی کے رویوں پر فنکارانہ انداز سے تنقید کرتا تھا اور عام انسانوں کے پیروں تلے بچھے ہوئے ہر جال سے آشنا تھا۔

وُہ اپنی ذات کے خارجی استحکام سے بے نیاز ضرور تھا۔ لیکن اپنی ذات کے اندر تخلیقی تجربوں کا ایک بحرِ بیکراں تھا۔ اس کے خیال کی وسعتوں کے اُفق دُور دُور تک پھیلے ہوئے تھے اور یہی وُہ صداقت تھی جو ساغر سے محبت کے رشتوں کی کڑیاں بن رہی تھیں۔ اس ساغر سے، جو دیکھتے دیکھتے کچھ عرصہ پہلے حوادث کی اندھی گلیوں میں راستہ بھُول گیا تھا۔

ہم دیکھ رہے تھے کہ وہ اپنی ذات کے اندر کے طویل سفر کی مسافتوں میں گم رہنے کے بعد جس ذلیشان وجود میں ڈھل رہا تھا۔ وہاں بھوک پیاس، محرومی، احتیاج اور مجبوری کا کوئی ذاتی صدمہ اور اس کا اظہار نہیں تھا۔ وُہ اپنے ارد گرد پھیلے ہوئے جہان میں اُن ذہنوں کا نقیب تھا۔ جو کچلے ہوئے تھے۔ اور رفتہ رفتہ اپنی انسانی نوع کے مرتبے سے محروم ہوتے جا رہے تھے اور یوں لگتا تھا۔ جیسے وُہ سب کچھ دیکھ ہی نہیں رہا۔ محسوس بھی کر رہا تھا۔

مجھے ریڈنگ روم کے قیام کے دوران ساغر کی شعری تخلیقات کے حوالے یاد آ رہے ہیں جو اس کے فکری تجربوں کی مکمل عکاسی کرتے ہیں درویش مسکراتا ہے۔ کی ردیف والی غزل اس نے ریڈنگ روم میں ایک گرم دوپہر کو سنائی اور وہ دُور دُور تک پھیل گئی ان دنوں گورنمنٹ کالج سیالکوٹ والے اُسے راہ چلتے اُچک کر سیالکوٹ لے گئے۔

اس کا تعرفی ترنم پہلے جیسا نہیں تھا۔ لیکن کلیم اختر نے بتایا کہ جب ساغر نے درویش مسکراتا ہے کی ردیف والی غزل پڑھی تو مشاعرہ کا رنگ بدل گیا

چمن پہ دام پہ درویش مسکراتا ہے
ہر اک مقام پہ درویش مسکراتا ہے
صراحی بزم میں جب قہقہے اگلتی ہے
سکوتِ جام پہ درویش مسکراتا ہے
ہزار حشر اُٹھائے تغیرِ دوراں!
تیرے خرام پہ درویش مسکراتا ہے
شفق میں خونِ شہیداں کا رنگ شامل ہے
فروغِ شام پہ درویش مسکراتا ہے

کبھی خدا سے شکایت کبھی گلہ خود سے
مذاقِ عام پہ درویش مسکراتا ہے
ہوس مشیر ہو جس بادشاہ کی ساغر
تو اس غلام پہ درویش مسکراتا ہے

سیالکوٹ کے مشاعرے سے واپسی پر ساغر کچھ زیادہ خوش نہیں تھا۔ سفر کی تھکان نے اُسے دو دن تک ریڈنگ روم کی کوٹھڑی میں بند رکھا۔ لیکن جونہی سیالکوٹ کے مشاعرے سے ملنے والی رقم اُڑ گئی تو وہ کوٹھڑی سے باہر نکل آیا۔

وہ کہا کرتا تھا: "اس شہر نا پرساں سے دامن چھڑانا مشکل ہے اور دامن چھڑانے کی ہر کوشش میں دامن تار تار ہوا ہے"۔ اس کے ہاں درد ایک مستقل کیفیت تھی اور رونما ہونے والے واقعات و حالات درد کے الاؤ روشن رکھتے۔ زندگی، آدمی اور خدا، کی تکون کائنات اور دستورِ محفل کی علامتوں کے بغیر وہ جو کچھ کہتا تھا اس کے پیچھے ایک فلسفیانہ نقطۂ نظر کا وسیع پھیلاؤ ہوتا تھا اور جب وہ خشک گھاس پہ پیروں کے بل بیٹھ کر منہ ایک طرف کیے اپنے سے باتیں کرنے لگتا جیسے زندگی نے اپنا مفہوم کھو دیا ہو۔ کیونکہ زندگی کے مفہوم کی تلاش میں اس نے اپنے وجود کی معنویت کو اپنے زمانے کے حوالے سے سمجھا تھا اور اسے اس بات کا انتہائی دکھ تھا کہ جسے آدمی کہتے ہیں اس کے لیے انسان بننے کا عمل بہت دشوار بنا دیا گیا ہے۔

ایک دن ہم سب آدمی کے موضوع پر گفتگو کر رہے تھے کہ اچانک ساغر آ گیا۔ یہ ایک گرم شام کا تذکرہ ہے جامن کے درخت کے نیچے کھردری گھاس پر سستے سگریٹوں کا دھواں پی رہے تھے اس نے سستی قسم کی باریک

ململ کی سیاہ چادر اوڑھی ہوئی تھی اور اس کا ہڈیوں بھرا جسم صاف دکھائی دے رہا تھا۔ پہلی بار اُسے ننگے بدن دیکھ کر احساس ہوا ہے کہ اس کا مادی وجود ہڈیوں کا پنجر بن چکا تھا۔ جس پر جلی ہوئی کھال اتنی کسی ہوئی تھی کہ ہڈیوں کی نوکیں تک اُبھر کر ظاہر ہو رہی تھیں اس کے لئے حیدر اور اعجاز نے جگہ چھوڑ دی اور حسبِ معمول سلام وغیرہ کے تکلف سے آزاد اس نے پیروں کے بل بیٹھ کر کہا۔

کیوں بابا، کس مسئلے پر الجھے ہوئے ہو؟
میں نے کہا۔ آدمی پر غور کر رہے ہیں۔
ساغر نے گردن موڑ کر آہستہ سے کہا۔ ہاں بابا بڑی ضروری مسئلہ ہے
اعجاز نے پوچھا۔ آپ کے ذہن میں کیا آتا ہے؟
ساغر نے مسکرا کر کہا۔ مجھے تو آدمی کے ذکر سے نظیر اکبر آبادی یاد آجاتا ہے یا جس نے آدمی کو آگے جانے والی روح سے ملایا ہے۔
ساغر بہت ہی خوشگوار موڈ میں تھا۔ اور بولا۔ فقیر نے بھی کچھ شعر آج ہی کہے ہیں۔
ہم لوگ حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے ساغر نے پوٹلی کھولی اور مڑے تڑے کاغذوں کے ایک پلندے سے خاکی لفافے پر لکھی ہوئی نظم آدمی نکالی اور بولا۔
پڑھ لو۔
میں نے کہا، ساغر آپ ہی سنائیں اور دیکھتے ہیں کہ آدمی کی آپ کے ہاں کیسی ویری انٹرسٹنگ ہیں۔
اچھا۔ یہ کہہ کر ساغر نے سگریٹ سلگایا، اور باغ کے چاروں طرف گہری نظر ڈال کر اس نے سر جھکا لیا۔ ساغر۔ جب بھی شعر سناتا تھا پوری محویت کے

ساتھ سناتا تھا اور لفظوں کی ادائیگی میں تقدس کا بہت لحاظ رکھتا تھا۔ اس
نظم سنانا شروع کر دی ہم پوری طرح متوجہ تھے۔ گرد و پیش کے بے معنی شور
ہماری سماعت کا رشتہ کٹ گیا تھا۔

اس وقت لفظوں میں اس کیفیت کو بیان کرتے ہوئے ساغر کی آواز
میرے ذہن میں جاگ اٹھتی ہے۔ ایک گھمبیر گداز لہجہ مجھے اپنی لپیٹ لے رہا
ہے اور میرے احساس میں ایک ترنم الوہی قسم کی سُریں بکھیر گئیں ہیں

راہزن آدمی راہنما آدمی
بارہا بن چکا ہے خدا آدمی
آس کی مورتیں پوجتے پوجتے
ایک تصویر سی بن گیا آدمی
کھل گئے جنتوں کے وہاں زائچے
دو قدم جھوم کر جب چلا آدمی
زندگی خانقاہِ شہود و بقا
اور لوحِ مزارِ فنا آدمی
کچھ فرشتوں کی تقدیس کے واسطے
سہہ گیا آدمی کی جفا آدمی
گونجتی ہی رہے گی فلک در فلک
ہے مشیت کی ایسی صدا آدمی

لاہور میں گرمی تیز ہوتی جا رہی تھی اور ریڈنگ روم بند ہونے کے بعد دوپہر
کے وقت اندر آ جاتے تھے اور حیدر کی اجازت سے پنکھا استعمال کر لیتے تھے
اُن دنوں شہر میں رزق کی تلاش کے بعد ریڈنگ روم ایک ایسی جگہ تھی جہاں
پنکھے کی ہوا نصیب ہوتی تھی۔ اور ہم معاشی جبر کے دکھوں کو بھولنے کے لیے

ادھر ادھر سے وہاں جمع ہو جاتے تھے۔ اور یوں لگتا تھا جیسے ہم نے کہیں بھی
نہیں جانا۔ ایک دوپہر لوہے کی میزوں پر لیٹے لیٹے میں نے حیدر سے کہا۔
یار حیدر: بڑے بیچ سے ہو کر رہ گئے ہیں کچھ سمجھ نہیں آتی۔ یہ ریڈنگ روم
بھی ایک زنجیر بن گیا ہے حیدر نے میرے اس فقرے پر ناک بھوں چڑھائی اور
ول ڈیوران کی داستانِ فلسفہ بند کر کے اُٹھا۔ پتا نہیں حیدر قسم قسم کی فلسفے کی کتابیں
کیوں پڑھا کرتا تھا، نہ صرف پڑھا کرتا تھا۔ بلکہ کاپیوں اور رجسٹروں میں
اُن کے صفحوں کے صفحے نقل کیا کرتا تھا۔ اس نے کافی دیر بعد میری بات کا
جواب دیا اور کہا "سچی بات ہے یونس ادیب میں بھی ریڈنگ روم میں اس
اجتماع کی وجہ سے پریشان ہو چکا ہوں" حیدر کی سچی بات تیر کی طرح میرے
دل کو لگی اس کے بعد دروازے پر زور زور سے دستک ہوئی۔ دستک اتنی
تیز تھی کہ حیدر نے جلدی سے اُٹھ کر دروازہ کھولا۔ باہر احمد نثار کھڑا تھا اور
کہہ رہا تھا۔

"حیدر جی! بس کچھ نہ پوچھو بڑا ظلم ہو گیا ہے عرش کے کنگرے ہل گئے ہیں"
بے چارا احمد نثار بڑا حساس انسان تھا۔ اس کا لہجہ ہی تڑپا دیا کرتا تھا اور
اس کے درد بھرے لہجے میں ظلم کا لفظ سن کر میں میز سے اُٹھا اور باہر نکلا
تو احمد نثار سے کچھ دور برآمدے کے باہر ساغر بابا بھی کھڑا تھا اور تھر تھر کانپ
رہا تھا اس کے ہونٹ خشک ہو رہے تھے۔ میں نے چاروں طرف دیکھنا
شروع کر دیا دھوپ ڈھلنے والی تھی اور بدرو کے کنارے والے باغ کے ٹکڑے
میں کچھ لوگ جمع تھے۔ جن کے چہروں پر بڑا اسرار، لیکن ندامت سے بھری ہوئی
خاموشی تھی۔ بدرو کے باڑلی کے پچھلی طرف جانے والی گلی سے دو آدمی
باہر آ رہے تھے ایک نے بے پناہ خوف زدہ ہوتی بچی کا بازو پکڑا ہوا تھا۔ اور

دوسرے نے سیاہ جلد والے نابینا ماسٹیے کو پکڑا ہوا تھا اور اسے گھسیٹ کر لا رہا تھا۔

ہر کوئی توبہ تا ب کر رہا تھا۔ فضا بڑی غلیظ ہو گئی تھی اور میں آہستہ آہستہ ساغر کے قریب گیا۔ تو وہ مجھ سے آنکھیں چرانے لگا۔ گردن ایک طرف جھکا دی اور بغیر کچھ کہے باغ سے باہر جانے لگا میں نے اُسے موری دروازے کی طرف جاتے ہوئے دیکھا۔

حیدر نے ریڈنگ روم بند کر دیا اور وہ بھی بغیر کچھ کہے ایک طرف چل دیا احمد نثار کا چہرہ سکڑا ہوا تھا، اس کے ایک ایک نقش سے غم بھی غم جھلک رہا تھا اور یوں لگتا تھا، جیسے ابھی ابھی چیخیں مار کر رونے لگا۔

ہم دونوں بھی باغ سے نکلے اور باغ کی درمیانی سڑک پر چلتے ہوئے ٹکسالی دروازے تک آ گئے۔ نہ اس نے کوئی بات کی اور نہ ہی کوئی لفظ میرے منہ سے نکلا۔ جب ہم اپنی خاموشیوں سے خود ہی اُکتا گئے۔ تو ایک دوسرے سے کچھ کہے بغیر رخصت ہو گئے۔ پھر ایسا ہوا کہ ہم سب کے راستوں سے ریڈنگ روم دُور ہو گیا حیدر نے اپنا تبادلہ کروا لیا۔ احجاد روزنامہ مغربی پاکستان میں کام کرنے لگا اور راحت راولپنڈی میں ملازمت کرتے کرتے ڈھاکہ پہنچ گیا، میں اور احمد نثار چند دنوں تک ریڈنگ روم کے باہر جلاوطنوں کی طرح آتے رہے ریڈنگ روم کی گول چھت پہ جانے والی کوٹھڑی کے دروازے پر نئے انچارج نے تالا لگا دیا اور جب ساغر بھی بہت دنوں تک نظر نہ آیا تو احمد نثار دوبارہ بسوں کے اڈے پر گولیاں ٹکیاں بیچنے چلا گیا اور مجھے ایک اور برطانوی فرم میں ملازمت مل گئی۔

ریڈنگ روم کا سین پیچھے رہ گیا لیکن کبھی کبھی مجھے ساغر آتا یاد آتا کہ میں میکلوڈ روڈ کو عبور کر کے شاہ عالمی نو ہاری اور انار کلی کی طرف ضرور جاتا۔ دیکھتے دیکھتے موسم بدل گیا اور سردیوں کا موسم آتے ہی بہت دنوں بعد مجھے ساجد انبالوی نے بتایا کہ ساغر صاحب ان دنوں اس کی بلڈنگ میں ٹھہرے ہوئے ہیں شاہ عالمی تیزی سے آباد ہو رہی تھی اور محلہ پری محل کی ایک نامکمل متروکہ عمارت کی سیڑھیوں میں ساغر نے ڈیرہ لگایا ہوا تھا۔ وہاں شبیر بجلی والا بھی مل جاتا تھا، وہ نہ تو شاعر تھا۔ نہ ادیب لیکن ساغر کو وہ زندگی کے فلسفے حل کرنے کی راہ میں اپنا مرشد سمجھتا تھا۔

شبیر بہت ہی بھلا آدمی تھا لیکن یہ بات اس کے ذہن میں پھنس گئی تھی کہ شہر ہر لمحہ لاکھوں کروڑوں وولٹ بجلی کے چالو سرکٹ میں الجھا ہوا ہے اور بجلی کنٹرول کرنے کا نظام اتنا پرانا ہے کہ کسی بھی وقت یہ لاکھوں کروڑوں وولٹ بجلی آؤٹ آف کنٹرول ہو کر خوفناک تباہی مچا سکتی ہے اور ضرورت اس بات کی ہے کہ لوگوں کو اس وقت کے آنے سے پہلے حفاظتی تدابیر کی تربیت دی جائے۔

شبیر بجلی والا مجھے اکثر ساغر کے ساتھ کے ساجد انبالوی کے غیر مکمل مکان کی سیڑھیوں والی ڈیوڑھی میں مل جاتا تھا اور میں محسوس کرتا تھا کہ ساغر بھی شبیر کی باتوں سے متاثر ہو گیا تھا۔ وہ دردمندانہ انداز میں شبیر سے حفاظتی تربیت کے سکول کھولنے کا منصوبہ سنا کرتا تھا۔ ساجد انبالوی بھی شاعر تھا اور اس کے بارے میں مشہور تھا کہ شاہ عالمی میں یہ غیر مکمل عمارت اس نے اپنے آپ حضور کی جائیداد کی دستاویزات تیار کرنے کی مہارت کے نتیجے میں حاصل کی تھی اور وہ بہت بڑا علامہ ادارہ کھولنے کے پروگرام ساغر کے سامنے بیان کرتا تو ساغر ایک طرف منہ کر کے سگرٹ

لمبے لمبے کش لگانے لگتا۔

مجھے یقین تھا کہ ساغر کو نہ تو شبیر بجلی والے کے تبلیغی سکول سے کوئی دلچسپی تھی اور نہ ہی ساجد انبالوی کے فلمی پروگرام پر اس کی نظر تھی لیکن وہ اُس کی گفتگو میں اس طرح شریک ہو جاتا۔ جیسے وہ بھی تن من دھن سے اُن کے منصوبوں میں شامل ہے، لیکن جب ساجد انبالوی کی اس تکرار سے تنگ آ جاتا۔ کہ گانے آپ ہی لکھیں گے تو ساغر بڑے پُر ملال لہجے میں کہتا "ہاں اس کا وقت فیصلہ کرے گا۔ تم فی الحال خاموش رہو۔"

ریڈنگ روم سے جبری بے دخلی کے بعد ساغر نے بڑے حوصلے سے ساجد کی سیڑھیوں والی ڈیوڑھی میں وقت گزارا۔ وہ سارا دن داتا دربار، ٹکسالی اور اس پورے بادامی باغ تک گھومتا رہتا۔ وہ ہمیشہ زمین کی طرف دیکھ کر چلتا تھا۔ اُس نے اپنے اس تجربے کا کئی بار اظہار کیا کہ زمین پر ننگے پاؤں چل کر یوں محسوس کرتا ہے جیسے اس کے اور زمین کے درمیان دوئی ختم ہو گئی ہے لیکن کبھی کبھی وہ گہرائی میں جاتا۔ لاہور کی بے رحم سڑکوں پر ننگے پاؤں چلتے چلتے اس کے پیروں کے زخم کھل اُٹھتے تو وہ بہت غمزدہ ہو جاتا، اس کے ہونٹوں پر لفظوں کے دیپ جل اُٹھتے غم انگیز آنکھوں کے خلا اور گہرے ہو جاتے۔

"ہاں فقیر کو کبھی کبھی یوں لگتا ہے۔ جیسے حسینؑ کی سُنت پوری کر رہا ہوں اور کربلا کے انگاروں پر چل رہا ہوں، شاید یہی میرا مقدر تھا۔ پر میں نے بھی تو یہی چاہا"

ایک گہری شام کو میں اور اکرام لدھیانوی شاہ عالمی کی طرف جا رہے تھے تو بڑی تیز بارش ہو رہی تھی۔ ہم نیا بازار سے بدرو کے کنارے چلتے ہوئے شاہ عالمی کی عمارتوں کے برآمدہ میں پہنچ کر ذرا رک گئے سڑک پر بارش کا پانی دُور دُور تک پھیلا ہوا تھا۔ بادلوں کی گرج بھی بڑی گونج دار تھی یا بار بار بجلی کڑک رہی تھی

برآمدوں میں کئی لوگ بارش رُکنے کا انتظار کر رہے تھے اور سرد ہواؤں سے بچتے بغلوں میں ہاتھ دبائے ہوئے سُکڑے تھے۔ اچانک بجلی کی چمک میں سڑک پار ہوتا ہوا ساغر دکھائی دیا۔ جو اس طرح کمبل اوڑھے چل رہا تھا۔ جیسے اُسے احساس تک نہ ہو کہ بارش بھی ہو رہی ہے۔ وہ بڑے مزے سے پانی سے لبریز سڑک پر چل رہا تھا۔ اور اس کی سیاہ چادر کا پلو پانی میں بھیگ کر بھاری ہو گیا تھا۔ اکرام نے اس طرف دیکھا اور ہم برآمدوں سے نکل کر اس کی طرف بھاگنے لگے۔ اکرام نے قریب جا کر کہا۔ ساغر کہاں سے آ رہے ہو بڑے اداس نظر آتے ہو۔ اکرام عموماً ساغر سے اسی بدتمیزی قسم کی بے تکلفی کا مظاہرہ کیا کرتا تھا اور ساغر نے اس کا کبھی بُرا نہیں منایا تھا۔ ساغر نے صرف ہماری طرف دیکھا اور کوئی جواب نہ دیا۔ جب ہم ساجد انبالوی کی بلڈنگ میں پہنچے تو وہاں ڈیوڑھی میں ساجد نے لمبی کچھائی ہوئی تھی اور آگ تاپ رہا تھا۔

اس شام بڑی شدید سردی تھی۔

ساغر نے اپنا کمبل اُتار کر ساجد کو دیا۔ اس نے کمبل کو جھاڑا اور جھٹی ہوئی اینٹوں والی ایک دیوار پر پھیلا دیا، ساغر نے چادر کا پلو نچوڑا اور آرام سے بوری پر بیٹھ گیا۔ اس نے ادھر اُدھر دیکھا۔ ڈیوڑھی میں صرف ایک موم بتی جل رہی تھی۔ ساغر اٹھا۔ اس نے اینٹوں کے طاق سے ایک نئی موم بتی نکالی اور اسے روشن کر کے اینٹ پر رکھتے ہوئے بولا۔

روشنی سے پیار بڑا ضروری ہے۔

اور پھر خود ہی اکرام کی طرف رُخ کر کے پوچھنے لگا۔ سنائیے اکرام صاحب آپ کی نظم بن گئی لیکن اس بارش اور سردی میں آپ یہاں بے آرام ہونے کیوں آ گئے ہیں۔

اکرام نے حسبِ عادت بدتمیز قسم کی بے تکلفی کا مظاہرہ کیا اور کہا۔
چھوڑو ان باتوں کو۔ کوئی شعر سناؤ۔

ساغر نے سر ہلا کر ہاں میں جواب دیا اور گولڈ فلیک کی سنہری رنگ کی ڈبی جاکٹ کی جیب سے نکال کر باہر رکھتے ہوئے بولا۔ ہاں بابا! شعر بھی سنائیں گے۔

"ایک تازہ غزل ہوئی ہے۔"

ساغر نے پھر بڑے پیار سے ساغر کی طرف دیکھا اور کہا۔ بھلے آدمی سے چائے ہی منگوا لو ورنہ ساری مدہوشی غارت ہو جائے گی۔

بارش بڑی تیز ہو گئی تھی سرد ہوا ڈیوڑھی کی فضا کو بار بار درہم برہم کر دیتی تھی۔ ساجد انگیٹھی کے بجھتے کوئلوں کو چھیڑنے لگا تھا۔ ساغر بجھتے کوئلوں کو اس طرح دیکھنے لگا۔ جیسے آگ کا کوئی قانون دریافت کر رہا ہو اور پھر ماچس کی تیلی سے راکھ کریدتے ہوئے کہنے لگا۔

"کچھ آگ کے کردار پر بات ہونی چاہیے۔ جب سے سردیاں آئی ہیں مد انگیٹھی سے آتا ہے تو میرا دھیان آگ کی طرف چلا جاتا ہے اور میں سوچتا رہتا جس نے پہلی بار آگ دریافت کی تھی۔ کتنا حیران ہو گیا ہو گا۔"

اکرام نے پھر بدتمیزی کی اور ساغر کی ڈبی سے سگریٹ نکال کر جلانے لگا
"ہم کوئی تم سے فلسفہ نہیں سننا چاہتا۔ کوئی شعر سناؤ۔"

ساغر کے ذہن کو بڑی طرح جھٹکا لگا۔ ڈیوڑھی سے باہر بارش آہستہ آہستہ ختم ہو رہی تھی۔ اکرام کی وجہ سے ساغر بڑی شدید ذہنی اذیت محسوس کر رہا تھا۔ اس نے چاہا کہ اکرام اور ہم چلے جائیں اس نے باہر کی طرف دیکھ کر کہا۔

"بارش ختم ہو گئی ہے شاید؟"

ہاں بابا، بارش ختم ہو گئی ہے: یہ لیں۔ ساجد نے یہ کہہ کر سامانِ مدہوشی کا

باہر رکھ دیا اور کہا۔ خالص چترال سے آیا ہے۔ ساغر نے حسرت بھری حیرانی سے کہا۔ اچھا!
اور پھر میری طرف متوجہ ہو کر بولا۔

آپ بڑے چپ ہیں؟

صرف سردی کی وجہ سے اور میں گھر جانا چاہتا ہوں وقت بہت ہو گیا ہے۔

"لیکن ٹھہریں میں آپ کو تازہ غزل سناتا ہوں کچھ شعر و شاعری ہو جائے۔"

ساجد سامانِ مدہوشی تیار کرنے لگا اور ساغر خود کلامی کرنے لگا۔

"بارش بھی ہم جیسی ہوتی ہے اگر بارش نہ ہوئی ہوتی تو یہ جگہ مرکز کبھی نہ بنتی۔ تم نے کتنے اچھے لوگوں کو بلا دیا ہے۔"

بارش میری دوست ہے، سارے موسم میرے دوست ہیں۔

میں ان کا دوست ہوں وہ میرے دوست ہیں۔

ڈیوڑھی میں جلتی ہوئی موم بتیوں کی زندگی بہت کم رہ گئی تھی۔ ساغر کا دھیان اس طرف چلا گیا تو دیوٹوں کے طاق سے پھر اس نے ایک ادھ جلی موم بتی نکالی اور اسے جلاتے ہوئے بولا۔

چراغ سے چراغ روشن ہوتے ہیں۔

ڈیوڑھی میں سگریٹوں کا دھواں بھر گیا تھا۔ ساغر کو اس دوران دو مرتبہ شدید کھانسی کا دورہ پڑا۔ اس کی گردن کی رگیں پھول کر باہر نکل آئیں اور اس کی آنکھوں سے پانی بہنے لگا۔ کافی دیر تک ہم سب چپ رہے اور اس خاموشی کی چادر سے ساغر نے منہ باہر نکال کر کہا۔ ہاں بھئی کچھ مکالمے ہونے چاہئیں۔

اکرام نے جواب دیا۔ تم نے تازہ غزل سنانے کا وعدہ کیا تھا۔

"لیکن سرکار ذرا ترنم سے عطا کریں تو کرم ہو گا۔" ساجد انبالوی نے خالص فلمی انداز میں درخواست کی۔ میری بھی آرزو یہی تھی۔ ساغر سے ترنم میں کچھ سنے عرصہ ہو گیا تھا۔

اس نے نیا سگریٹ سلگایا اور خلا میں گھورنے لگا۔

ہونٹوں پر زبان پھیری پھر آنکھیں بند کر لیں۔ جیسے سُریلی لیکن مدھم ہوں گلے سے نکالی، شاید وہ بھولی ہوئی سُروں کو آوازیں دے رہا تھا۔ دو تین منٹ تک وہ اسی طرح آنکھیں بند کر کے لمبی مسرتی ہوں میں گم رہا اور پھر رفتہ رفتہ دھیمی کی تیز ہوتی فضا میں ساغر کے گلے سے سونے چاندی کے سکے نکل کر بکھرنے لگے، اکرام دو زانوں ہو کر بیٹھا تھا اور میں آلتی پالتی مارے ساغر کی طرف نہیں، ان لفظوں کی تصویریں دیکھ رہا تھا جو اس کے ہونٹوں سے سُروں کا لباس پہن کر نکل رہے تھے۔

چھپا کے دل میں غموں کا جہان بیٹھے ہیں۔
تمہاری بزم میں ہم بے زبان بیٹھے ہیں

یہ اور بات کہ منزل پہ ہم پہنچ نہ سکے
مگر یہ کم ہے کہ راہوں کو چھان بیٹھے ہیں

فغاں ہے درد ہے سوزِ فراق و داغِ الم
ابھی تو گھر میں بہت مہربان بیٹھے ہیں!

اب اور گردشِ تقدیر کیا ستائے گی
لُٹا کے عشق میں نام و نشان بیٹھے ہیں

ہے میکدے کی بہاروں سے دوستی ساغر
ورائے حدِ یقین و گمان بیٹھے ہیں

ساغر نے غزل ختم کی تو یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے درد کی چھریاں روح میں اتار دی ہوں وہ خود نڈھال ہو چکا تھا۔ اس نے دیوار سے ٹیک لگالی تھی اور اس کا سینہ دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔

میرے ہونٹوں سے ایک آہ نکل گئی اور اکرام نے بوٹ پہننے شروع کر دیئے۔

موم بتیوں کے کمزور شعلے سوہواؤں میں لرز رہے تھے ساحبد انبالوی بھی بُت بنا بیٹھا تھا۔ اور جب میں اکرام سے جدا ہو کر لال مسجد کے قریب گزر رہا تھا۔ ساغر کی تازہ غزل "چھپا کے دل میں غموں کا جہان بیٹھے ہیں" میرے ذہن میں گونج رہی تھی۔

بارش ختم ہو چکی تھی لیکن راستوں پر پانی ابھی تک کھڑا تھا۔ اندرون شہر کی گلیوں اور بازاروں سے گزرتے ہوئے بار بار ساغر کی آواز میرے ذہن میں گونجی اور سرد ہواؤں سے ٹھٹھرتی ہوئی ڈیوڑھی کی دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھا ساغر مجھے نظر آیا۔ جو اپنی ذات کے اندر مسلسل سفر میں تھا اور اس تیرگی کائنات میں اپنے وجود کے تجربوں کی گواہی تخلیق کر رہا تھا۔

بے وجہ تو نہیں ہیں چمن کی تباہیاں
کچھ باغباں ہیں برق و شرر سے ملے ہوئے

ساغر یہ وار دات سخن بھی عجیب ہے
نغمہ طرازِ شوق ہوں لب ہیں سلے ہوئے

ساقیا! اہتمامِ بادہ کر
وقت کو سوگوار دیکھا ہے

اس کے چہرے کی تازگی مدھم ہوتی جا رہی تھی اور اس کے سیاہ گھنگھریالے بالوں میں مٹی جمنے لگی تھی۔ اس نے جو کپڑے پہنے ہوتے تو ان کی خستگی ساغر کے کسی باطنی کرب کا راز بن جاتی، وہ خود کلامی کرنے لگا تھا۔ شاعروں میں جاتا تو اس کے شعروں میں تازہ لمحوں کی آنچ احساس کو چھونے لگتی اور وہ درد کی ایک لازوال دنیا کا باشندہ دکھائی دینے لگتا جیسے زمین سے اس کے سارے رشتے تیزی سے ٹوٹ رہے ہوں اور وہ بے ربط تعلقات کے کھوکھلے پن کے انکشاف پر چونک پڑا ہو۔ اس کی آنکھوں کے کنول اداس ہو گئے تھے۔

وہ خیال کی کن انوکھی منزلوں پہ تھا؟ اس کا اندازہ کرنا بہت ہی مشکل تھا۔ زندگی کی بے ثباتی اور بے قعتی کے شعور نے اسے تڑپا کر رکھ دیا تھا۔ اور شاید اسے اس زینہ پر ذات کی تکمیل کی راہ میں ابتدائی ناکامیوں نے تبدل بنا دیا تھا یا اپنی نا میاتی اکائی کے شعور نے اسے اتنا حیران کر دیا تھا کہ وہ گرد و پیش سے اپنے تعلق کی کڑیوں کی

تلاش میں تنہا ہی اجنبی راہوں پر چل پڑا تھا۔

وہ کیا دیکھ رہا تھا؟

وہ کیا محسوس کر رہا تھا؟

اور اس کے ذہن کی جولانی کن جہتوں کی طرف پھوٹ پڑی تھی۔؟

گرمیوں کی ایک گہری ہوتی شام کو میں ممتاز ہوٹل سے نکل کر اردو بازار کی طرف جا رہا تھا تو سنسان فٹ پاتھ پر ادبِ لطیف کے دفتر کی عمارت کی گلی سے ایک سایہ نکلتا ہوا دکھائی دیا۔ یہ سایہ ساغر صدیقی کا تھا۔

اس کے چہرے پر افسردگی کی دھول تھی اور آنکھوں کے خلا بے حد وسیع تھے

اس نے میرے پاس آ کر قدم روک لیے اور میں نے پوچھا

کہاں سے آ رہے ہیں تم؟

"تم پوچھتے ہو کہ کہاں سے آ رہا ہوں؟ مجھے تو بالکل خبر نہیں"۔ ساغر کی آواز میں تھرتھراہٹ تھی۔ اس نے پھٹی ہوئی قمیض کی اوپر والی جیب سے سگریٹ کی ڈبی نکالی اور میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا

"آؤ ادھر چلتے ہیں۔" میں ساغر کی اس دعوت کو رد نہ کر سکا۔

ہم نگار سینما کے ساتھ ڈلدو محمد دین کے احاطے میں کوچوانوں کی جھونپڑیوں کے پاس سے گزر کر ایک کوٹھڑی میں داخل ہوئے تو اس میں کڑوے تیل کا ایک دیا جل رہا تھا اور نیم اندھیرے اور نیم اجالے میں میں نے ایک بوڑھے کو دیکھا جس نے بیٹھے بیٹھے آواز دی کیا ساغر صاحب ہیں؟ ہاں ہاں سائیں۔ کیا حال ہیں۔ ساغر نے رنجیدہ سی ہوئی لیکن پھیلانے والی آواز میں پوچھا اور مجھے چٹائی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ گامی سائیں نے اپنے سامنے پڑی ہوئی چٹائی کو پرے سے جھاڑتے ہوئے کہا حال کی کوئی خبر تو نہیں۔ یہ ایک واردات

سے بیٹھ جاؤ تو بتاؤں۔ میری تو بڑی سخت ڈیوٹی لگ گئی ہے۔" ہمارے سامنے گامی سائیں آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا اور ساغر دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے گم سم دھواں کھائی ہوئی چھت کو تک رہا تھا۔

اس کوٹھڑی پر مجھے زارِ روس کے وقت کے جیل کھانے کا گمان ہونے لگا تھا۔ گرمی بھی بہت تھی اور ہوا کے اندر آنے اور جانے کے لیے ایک ہی دروازہ تھا جس میں سے گھوڑوں کی لید اور جھونپڑیوں کے بیچوں بیچ بہنے والی گندے پانی کی موری سے آنے والی بُو اندر آ رہی تھی۔ بڑا تعفن تھا گامی سائیں نے گردن موڑ کر ساغر کی طرف دیکھا اور کہنے لگا۔ "جو چپ تھا بس اگر پیا۔ کچھ تو بولو اور تم نے میرا حال پوچھا تھا۔ اب منہ میں گھنگھنیاں ڈال کر چپ ہو گئے ہو ساگر ساب او، ساگر ساب۔

میرا دم گھٹ رہا تھا اور میں سوچ رہا تھا۔

ساغر جیسا تیز جمالیاتی حس رکھنے والا شاعر اس بدبودار فضا میں کیسے سانس لے رہا ہے۔

اچانک عاشق سائیں اندر داخل ہوا۔ اس نے اپنی تاج نما ٹوپی اتار کر اپنا رنگین اور گوٹے کناری والا ڈنڈا کونے میں رکھا اور اپنی چھوٹی چھوٹی چمکدار آنکھوں کو سکیڑ سکیڑ کر ہمیں دیکھنے لگا۔ پھر ساغر کو ٹکٹکی باندھ کر مسلسل دیکھنے لگا اور خود ہی بڑبڑانے لگا۔

سخی شہباز قلندر
ٹرین لیٹ ہو گئی ہے۔
سارا ریلوے کا نظام میرے سپرد ہے۔

پھر اس نے اپنے عجیب و غریب لباس پر لگی ہوئی پیٹی میں سے وسل نکالی، اسے گارڈ کی طرح بجا کر کھڑا ہو گیا۔

وسل کی آواز سے ساغر نے آنکھیں کھولیں۔ قریب آیا اور گھٹنوں کو جوڑ بیٹھ گیا۔ میں نے کہا۔

"میں چلتا ہوں۔ بہت دیر ہو گئی ہے۔"

ساغر نے کوئی جواب نہ دیا اور میں نے دیکھا کہ عاشق سائیں نے سگریٹ بنانے کی مشین لگا دی اور ساتھ ساتھ بے ربط باتیں کرتا رہا۔

"مجھے تیری گلی سے بیت رہے تھے" — میں نے گھبرا کر ساغر سے کہا۔

"آؤ چلیں۔ ساغر یہاں بہت گرمی ہے۔"

"ٹھیک ہے تم جاؤ۔" ساغر نے بے نیازی سے جواب دیا۔ میرا دل نہیں چاہتا تھا کہ ساغر کو یہاں چھوڑ کر چلا جاؤں۔ میں اسے اپنے ساتھ اس غلیظ ماحول سے نکال کر باہر جانا چاہتا تھا۔

لیکن میں اسے کہاں لے جا سکتا ہوں۔ اس پورے شہر میں یہی ایک بدبودار کوٹھڑی تھی جہاں ساغر ٹھہر سکتا تھا۔

میں دوسرے دن اسے تلاش کرنے گامی سائیں کی کوٹھڑی میں گیا۔

تو میں نے گامی سائیں سے پوچھا۔

"ساغر کہاں ہے؟"

اس نے عجیب سی ہنسی ہنس کر کہا۔

کدی گوا چے لال وی لبھے نئیں۔

ساغر پھر اس شہر میں گم ہو گیا تھا اور برطانوی فرم میں ملازمت کے دوران بہت کم وقت ملتا تھا۔ اس کے علاوہ میں نے میکلوڈ روڈ پر مستقل جانا شروع کر دیا تھا۔ برسٹل اور اوسس میں جاتے پیتے ہوئے ساغر کا خیال آتا تو دھیان ان بدبودار کوٹھڑیوں کی طرف چلا جاتا جہاں زندگی بے معنویت کا شکار ہو جاتی ہے۔ ان دنوں میرا زیادہ میل جول شفائی سے تھا جو لارنس روڈ پر اجالے کے دفتر میں کام کرتا تھا اور میں دفتر سے نکل کر سیدھا اجالے کے دفتر میں جاتا۔ پھر سرور کاشمیری کے ساتھ پر میکلوڈ روڈ پر آ جاتے۔ مجھے یاد نہیں میں میکلوڈ روڈ پر جانے کیوں نکلا تھا۔ سردیوں کی ایک شام ایم اسماعیل سلطان، اجمل اور فوٹوگرافر حفیظ قندھاری کے ساتھ برسٹل ہوٹل میں بیٹھا تھا کہ سرور کاشمیری نے آ کر بتایا کہ دیال سنگھ کالج میں مشاعرہ ہو رہا ہے۔

شہزاد! تھ

بھی راز مراد آبادی کے ساتھ حافظ کے ہوٹل سے وہاں آ گیا اور ہم ان کے ساتھ دیال سنگھ کالج کے ہال میں پہنچے تو وہاں ہال کھچا کھچ بھرا تھا اور سٹیج پر شاعروں کا ایک ہجوم تھا۔ فوراً ہی میں نے سٹیج پر ساغر صدیقی کو دیکھ لیا اور میں اس کے قریب چلا گیا۔

"اچھا ہوا ہے تم آ گئے ہو۔" ساغر نے میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں حسرتوں کے سمندر کھول رہے تھے اور اس کے جسم پر میلا کچیلا لباس تھا اور بہت ہی سستے سگرٹوں کی ڈبیا اس کے ہاتھ میں تھی۔ وہ بولا "خود نہیں آیا شیدائی لے آیا ہے۔" قدیر شیدائی نے فوراً کہا "مولانا! ساغر صاحب کو بڑی کوشش سے لایا ہوں۔"

ساغر کرسی پر بیٹھا تھا اور اس کا دایاں ہاتھ مسلسل ہل رہا تھا اور بار بار اپنی بڑھی ہوئی ٹھوڑی پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ وہ مسلسل سگریٹ پی رہا تھا۔ اور یوں لگتا تھا جیسے وہ وہاں ہوتے ہوئے بھی موجود نہیں ہے۔ تھوڑی دیر بعد اس کا نام سٹیج سے لیا گیا۔ شیدائی نے اس کا کندھا ہلایا تو اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ "آپ کو بلایا جا رہا ہے" میں نے کہا۔ ساغر بے دلی کے ساتھ اٹھا اور سائے کی طرح چلتا ہوا مائیک تک گیا۔ چند لمحوں تک چپ رہا۔ پھر اس کے گلے سے شعروں کی آبشار بہہ نکلی اور جب تک وہ غزل پڑھتا رہا ہال پر اس کے احساس میں رچے ہوئے درد کی چادر سی تنی رہی۔

چھپا کے دل میں غموں کا جہان بیٹھے ہیں
تمہاری بزم میں ہم بے زبان بیٹھے ہیں

مشاعرے کے بعد کچھ طالب علم اسے زبردستی کینٹین میں لے گئے اور ایک طالب علم نے پوچھا "ساغر صاحب! یہ کس کی بزم ہے جس نے آپ کو بے زبان بنا دیا ہے۔"

پہلے تو ساغر ساکت سا رہا اور پھر سنجیدگی کے پردوں سے باہر آ کر بولا۔

"دوست! ابھی ان سوالوں کا جواب نہیں ملا۔ کیا کروں، سوال بھی خود ہوں اور جواب بھی خود ہوں۔

"کیا خبر تھی کہ زندگی ایک حسین لیٹرا ثابت ہو گی۔ مجھ سے کوئی اور سوال کر کے مہربانی نہ کرنا۔ میں اپنے خیال کا غلام ہوں۔"

طالب علم اُسے حیرت سے تک رہے تھے۔ کوئی کچھ بھی نہ سمجھ سکا لیکن وہ اپنی بے ربط باتوں سے کئی سوال پیدا کر گیا۔ وہ اسی طرح کنٹین سے اٹھا جیسے کوئی چیز اُسے زبردستی حواس کی دنیا سے باہر کھینچ رہی اور اس کے شانہ بدن نے اُسے حیرت زدہ کر دیا ہو۔

رات کے بارہ بجنے والے تھے۔ دیال سنگھ کالج کے ساتھ ساتھ گندے انجن کی طرف جانے والی سڑک پر چلتے ہوئے اس نے کوئی بات نہ کی، میں نے قدیر شیدائی سے پوچھا۔ کیا ساغر ان دنوں تنہا کمرے میں رہتا ہے۔

"رہتے تھے مولانا لیکن آج یہ واپس جانے کے موڈ میں نظر آتے

شاہ ابوالمعالی کے مزار کی طرف جانے والی سڑک پر اچانک شفیع پستول سامنے آگیا۔ وہ ساغر کو امرتسر کے حوالے سے جانتا تھا۔ وہ اسے دیکھتے ہی کہنے لگا۔

"اوئے۔ تم نے کیا اپنا خانہ خراب کر لیا ہے۔ دیکھو یار۔ یہ امرتسر میں سوا سولہ آنے ٹھیک ہوتا تھا۔ یہ خانہ خراب شاعری اس کو لے ڈوبی

ساغر شفیع پستول کے اس جملے کی تاب نہ لا سکا۔ وہ خشک پتے کی طرح لرز گیا۔ اگر ریاض تسنیم نہ آ جاتا تو شاید شفیع پستول کی باتوں سے ساغر تڑپ کر رہ جاتا۔ ریاض تسنیم نے شفیع پستول کو روکا اور ہم شاہ ابوالمعالی کے مزار سے بھی آگے نکل گئے۔

میں نے پوچھا ان دنوں مرکز کہاں ہے۔

اس نے جھکا ہوا سر اٹھا کر کہا۔ مرکز کی میں تلاش میں ہوں۔ اور میرے لیے اس جال سے نکلنا مشکل ہے۔ میں احساس کے الٹے پیروں پر چلی

ہو میرا کون ہے۔ یہ سوچنا پڑے گا : اور کاغذ کا کفن تیار کر رہا ہوں۔ زندگی شاید کوئی مقصد نہیں رکھتی اور ہو سکتا ہے زندگی میں مقصد اش کرنا ایک احمقانہ خیال ہو۔ پر بابا۔ میں تو یہ سوچتا ہوں کہ میں کون ہوں جب یہ سوچ نہیں تھی تو ذہن پر کوئی بوجھ نہیں تھا۔ بابا کوئی بوجھ نہیں تھا۔ تو میں سوال بنتے جا رہے ہیں کہ کیا مشیت کی یہی صدا ہے!

ساغر باتیں کرتا جا رہا تھا اور قدیر شیدائی ہر بات پر چونک کر میری طرف دیکھتا تھا، شاہ ابوالمعالی کے مزار سے آگے ایک گلی میں جہاں پہلوان کی بڑی بیٹھک تھی۔ ساغر نے رک کر کہا "مجھے یہ گلی بلا رہی ہے۔ تم جانا چاہو تو اکیلے جانا ہے"

ساغر ہمارا جواب سنے بغیر سائے کی طرح گلی میں داخل ہوا اور اندھیرے میں ب ہو گیا۔ میں قدیر شیدائی کے ساتھ واپس آ رہا تھا تو گوردوارہ جنم نگر اور الشٰی کی درمیانی سرحد پر کھڑے ہو کر اس نے کہا۔

مولانا! میں نے بڑی مشکل سے حضرت صاحب کو اپنے پاس رکھا ہوا تھا، لیکن کیا کروں، ٹکے کا نام نہیں لیتے۔

قدیر شیدائی بھی ساغر کا دوست اور مداح تھا۔ کبھی کبھی اس سے غزلوں کی اصلاح بھی کروا لیتا تھا اور شاید اسی حوالے سے ساغر اس کے مکان کے میں پناہ گزیں تھا۔

قریب دار کٹا دن تو رات کانٹو ہے ممکن ہے ساغر نے یہ سن لیا ہو۔ لیکن اس نے شاہی مسجد کے مینار دن

گزار دی ہے کسی نے حیات کانٹو پن دیکھنا شروع کر دیا اور اعجاز کے پوچھنے پر بتایا کہ وہ پہلوان کی کٹڑی

بکیہ صابر شاہ میں آگیا ہے۔

احمد نے پوچھا شاعری کا کیا حال ہے؟

ساغر نے ایک لمبا سانس لے کر کہا نہیں اپنے حال کی خبر نہیں۔ شاعری کا کیا

ستا ہیں۔ ساغر اپنے شعری جہان سے بھی محروم ہو چکا تھا۔ بس اُلجھے اُلجھے

ایک شام ہم حضوری باغ کا چکر لگا کر شاہی مسجد کے پیچھے تکیہ صا ں میں کھویا رہتا تکیہ صابر شاہ میں۔ آصف جلہ، اعجاز شاہ، حسن لطیف

کی طرف جا رہے تھے، یہ جگہ ہمیں بہت پسند تھی۔ بڑی خوبصورت اور انور شاہ باقاعدگی سے آیا کرتے تھے اور منظر ظاہر اپنی ظلم جبر کی

ہوتی تھیں۔ اس طرف سے کبھی کبھی کوئی ٹریفک گذرتی تھی۔ ی میں مصروف تھا۔

ڈنٹیل ہسپتال کی دیوار کے ساتھ فٹ پاتھ پر بجلی کے کھمبے کی رو منظر ظاہر نہ جانے کس طرح ساغر سے یہ گانا لکھوانے میں کامیاب ہو گیا

میں ہم بیٹھے تھے۔ شاید چاند بھی نکلا ہوا تھا اور شاہی مسجد کے گنبدوں کی ہلا تینوں ڈنڈیاں کڑا کے دے گیانی

ڈھلی ڈھلی دکھائی دیتی تھی۔ فاروق عادل اور احمد نثار بھی تلاش کرتے منڈا ما چھے دا،

آگئے اور فٹ پاتھ پر ایک ادبی محفل منعقد ہو گئی۔ لیکن ہمارا دھیان اس ظلم جبر کے ریلیز ہونے تک ساغر تکیہ صابر شاہ میں مقیم رہا جب جبرد

کی طرف چلا گیا۔ جو پراسرار تاریکی میں لرزیدہ نظر آتا تھا۔ ریلیز ہوئی اور یہ گانا پاکستان کے تمام ریڈیو سٹیشنوں کے فرمائشی پروگراموں

یہ تو ساغر ہے، اچانک احمد نثار کے منہ سے نکلا اور تھوڑی دیر بعد ہم بار بار نشر ہونے لگا تو ہم سب نے شاعر کو مشورہ دینا شروع کر دیا کہ وہ

دیکھا کہ ساغر صدیقی تکیہ صابر شاہ کے دروازے کی طرف جانے والی گھاٹی بڑی کے جنگلوں کو خیر باد کہے اور دوبارہ فلموں میں گیت لکھنا شروع کر دے

رک گیا تھا۔ ساغر سے یہ ملاقات بڑی عجیب تھی۔ اس نے اپنی بند ہوتی ہو غرض ہوں ہاں میں ٹال دیتا۔ غالباً وہ لکھنے لکھانے سے بھی معذور ہو چکا تھا

آنکھوں سے ہمیں دیکھا اور پھر گہری سنجیدگی میں ڈوب گیا۔ اس کی مٹھی میں دونوں ہم سب ایک طرح سے بے عمل خیال پرستی کے نشے میں گم تھے۔ ہماری

مڑے تڑے سگریٹ تھے اس کے جسم پر انتہائی بوسیدہ چادر تھی اور ہیں اور خیال و اقلیت پسندی کا مظہر تھے۔ آوارگی کی زنجیر ٹوٹی ہماری

پاجامے کی جگہ ایک سیاہ چادر اس کا ستر بنی ہوئی تھی۔ اور ہماری تحریریں کسی بڑے آدرش اور خیال سے خالی تھیں لیکن علم اور

فاروق عادل نے حسب عادت اپنا فیصلہ دیا۔ ساغر صاحب کا نشے جنون کی حد تک لگاؤ ہمیں لیے لیے پھرتا تھا۔ اس کے باوجود

محدود سوچوں کے دائروں سے ہم باہر نکل سکے۔
خارجی حالات کا کوئی گہرا شعور نہ تھا اور نہ ہی ہم یہ جان سکتے تھے کہ
کے ساتھ کیا بیت رہی ہے۔؟
اکرام سے میری تقریباً روزانہ ملاقات ہوتی تھی اور اس دوران
حنیظ قندھاری فوٹوگرافر اور حامد میاں بھی ہماری ملاقاتوں میں شریک ہونے
گئے تھے۔ حنیظ قندھاری نے ساغر سے ملنے کا پروگرام بنایا اور میں
لے کر تکیہ صابر شاہ میں چلا گیا تو ساغر وہاں سے بھی غائب ہو چکا تھا۔
انارکلی میں گنپت روڈ کے ناکے پر ایک لیٹر بکس ہمارا میٹنگ پوائنٹ
ہوا تھا جس کے سامنے جالندھر کیفے کے اوپر اکرام کے والد صوفی بر
آستانہ تھا۔
ایک شام ہم لیٹر بکس سے ٹیک لگائے کھڑے تھے اور اکرام بتا
کہ اس کا نولکھا کا سکیم منظور ہو گیا ہے اور وہ مال روڈ کا انڈس ہوٹل
کروانے میں لگا ہوا تھا۔
اکرام لدھیانوی سکیم کے منظور ہونے سے بے حد خوش تھا اور
رہا تھا اب میں سپین کی سیر کرنے جا سکتا ہوں اور وہاں سپین
ساحل پر سیپیاں چننے والی لڑکیوں سے کہوں گا۔
میں تمہارے دیس میں اجنبی ہوں، آؤ میرے ساتھ تاکہ میں
پیارے افسانے لکھ سکوں۔
میں اس کے اس جملے پر ہنس پڑا اور اکرام نے کہا "تم غریب آدمی
تم ان خوابوں کو نہیں سمجھ سکتے۔" اکرام ابھی اپنے خوابوں کی بات کر
تھا۔ گنپت روڈ کی طرف سے ساغر آتا ہوا دکھائی دیا۔ اس کے ساتھ ایک

تباہ حال شخص تھا جس نے جسم پر بوری لپیٹی ہوئی تھی۔ اگر اکرام انہیں روک
شاید وہ دونوں ایک روڈ کی طرف مڑ جاتے۔ وہ انہیں لیٹر بکس
کے قریب لے آیا اور کہنے لگا "یہ نشہ وشہ چھوڑ دو۔ تمہارا خانہ خراب کر دیا ہے
نے۔" ساغر اس فقرے پر تلملا اٹھا اور میری طرف شکوہ بھری آنکھوں
سے دیکھنے لگا۔ میں نے پوچھا تم کہاں چلے گئے تھے۔ میں تو سمجھا تھا کہ تم دوبارہ
میں چلے گئے ہو؟
ساغر نے زمین کی طرف دیکھ کر کہا "میں کہاں جا سکتا ہوں۔ زندگی
خرید و فروخت کا نام ہے اور میرے پاس بیچنے کے لیے کچھ نہیں" تو اب کب
میرا سوال تھا جس کا ساغر نے ایک طرف دیکھتے ہوئے یہ جواب
دیا۔
کرتا کیا ہے اور میں ان حالات میں کر بھی کیا سکتا ہوں جب میں
ابھی تک اپنے ذہن میں ایک سوالیہ نشان بن چکا ہوں۔ فقرے ساری
میں چھین لی گئی ہیں" "مگر رہتے کہاں ہو؟" اکرام نے پوچھا۔
ساغر نے ادھر ادھر دیکھا اور اپنی تار تار قمیض کے پلو انگلی پر لپیٹتے ہوئے
کہنے لگا۔ اس آسمان کے نیچے اور اس زمین پر۔
اکرام نے جلدی سے کہا "تم دوبارہ میرے پاس آجاؤ۔"
میں خاموشی سے یہ سب کچھ سن رہا تھا اور میری اپنی یہ خواہش تھی کہ
ساغر دوبارہ ڈاکٹر برق کے آستانے پر آ جائے جس کا دروازہ کبھی بند نہیں
ہوا تھا اور آستانے کی بوسیدہ چٹائیاں ہر کسی کا خوشدلی سے استقبال
کرتی تھیں۔
میں نے بھی زور دے کر کہا "ساغر تم آج ہی اکرام کے ہاں آجاؤ۔"

"ہاں سوچیں گے۔ اگر خیال نے دامن چھوڑا تو ضرور آجاؤں گا۔" ساغ
نے آہستہ آہستہ سے کہا اور مفلوک الحال شخص کے ساتھ چل دیا۔

"یار ساغر بھی عجیب مسئلہ ہے اور..." اکرام نے میری بات کاٹ کر
کوئی مسئلہ نہیں۔ سیدھی سادی بات یہ ہے کہ وہ پاگل پن کا شکار
گیا ہے۔

کیا واقعی ساغر پاگل پن کا شکار ہو گیا تھا یا زندگی اس کے لیے سا
ہو گئی تھی۔!

شہر کی گلیاں، بازار، چوک اور شاہراہیں اس کے پیروں تلے تھیں
اس کے حواس تیزی سے درہم برہم ہو رہے تھے جیسے قدم قدم پر اک
نئے مفہوم نے اسے چونکا دیا ہو۔

حفیظ قندھاری اپنا کیمرہ لے کر راولپنڈی سے مستقل طور
لاہور آگیا تھا اور اس نے ساغر کو تلاش کر کے ڈاکٹر برق کے آستانے
پر اسے رہنے پر مجبور کر دیا۔ اس شہر میں صرف حفیظ قندھاری ایک ایسا
وجود تھا جس نے ساغر کے رویے پر کوئی تنقید نہیں کی تھی۔ اس کے سا
سراپا ادب اور محبت بن جاتا تھا۔

حفیظ قندھاری کی محبت اسے ڈاکٹر برق کے آستانے پر لے آ
تو ڈاکٹر برق کی صوفیانہ شفقت نے بھی ساغر پر ایک عجیب سا تاثر چھو
وہ اندر داخل ہوتا تو ڈاکٹر برق کہتے۔

آؤ بھئی درویش میاں بیٹھو اور یہ لو سگریٹ پیو۔

ساغر خوش ہو کر ان کے قریب بیٹھ جاتا اور جب جانے لگتا تو ڈاکٹر

برق کہتے اچھا بھئی۔ اللہ خوش رکھے۔

ڈاکٹر برق کے آستانے پر ساغر کے حواس
کچھ کچھ مرتب ہونے لگے تھے اور ہم ساغر کو آستانے سے آمادہ کر کے لوہاری
دروازے کے باغ کی درمیانی سڑک پر آجاتے۔ وہ بہت کم باتیں کرتا
تھا لیکن بے ربط باتوں کا سلسلہ شروع ہوتا تو ٹکسالی دروازہ کے باہر
تک جاری رہتا۔

فقیر بے رنگ ہے۔ کڑی دھوپ کا سایہ ہے۔

آرزو کے بے نام صحراؤں میں زندگی عنوان تلاش کرنے پر مجبور ہے۔

ہر شے پُر ملال ہے۔

ہر لب سوالی ہے۔

تم دیکھو گے۔ مجھے صلیب پر چڑھایا جائے گا۔ لال ٹوپیوں والے بچوں
کو نیزوں پر اچھالیں گے۔ منزل کی تلاش میں حادثوں کا مشاہدہ کرنا جان
جوکھوں کا عارضہ ہے، سارے کرم گہری نیند سو گئے ہیں اور اپنے حال
کا میں خود تماشائی ہوں۔

ساغر کے بارے میں میرا جذباتی ہونا سب کو بُرا لگتا تھا اور میں موری
دروازہ کے باغ میں گول ریڈنگ روم کے آس پاس ساغر کا ذکر چھیڑ دیتا
تو اکرام چڑ سا جاتا۔ انتہائی کمینگی بھرے لہجے میں کہتا۔

پاگل ہو گئے ہو۔ ساغر کو بھول جاؤ اور میرے ساتھ ہیں جانے کے پروگرام بناؤ
ہم بے شمار دولت پیدا کر سکتے ہیں۔ ساغر اب نہیں بچ سکتا۔ وہ نشے کے
تیزاب میں گل سڑ جائے گا اور کیا تم بھی گلنا سڑنا چاہتے ہو؟

میں خاموش ہو جاتا۔ کیونکہ اکرام میری اس بات سے اتفاق نہیں کرتا تھا کہ ساغر جس گمشدگی کے تجربے سے گزر رہا ہے، وہ عام آدمی کا تجربہ نہیں۔

ہمیں ایک دوست کے طور پر اس کے بارے میں سوچنا ہوگا۔

اور اس سے دامن بچا کر الگ ہو جانا دوستی بھی تو نہیں ہے۔

اکرام کی طرح بعض اور لوگ بھی ساغر کے بارے میں مایوسی کا اظہار کرتے تھے اور ان کا خیال تھا کہ ساغر کو اس کے حال پر چھوڑ کر اپنے بارے میں سوچنا چاہیے

وہ پیچھے رہ گیا ہے

واقعی ایسے لگتا تھا جیسے وہ بہت پیچھے رہ گیا ہے اور پھر تیزی سے اس کا عکس بھی غائب ہو جانے والا ہے۔ زندگی کے وسیلوں سے محروم اور خود کو عدم تحفظ کی اندھی لہروں کے سپرد کر دینے کے بعد اس کے پاس کچھ بھی نہیں رہ گیا تھا۔ صرف ان خیالوں کے سوا، جو اس کے ساتھی تھے۔ ایسے الجھے نہ سمجھ آنے والے، بے ربط خیال۔ جن کا مفہوم وہ خود ہی سمجھتا تھا لیکن کرب کے بے پناہ احساس نے اُسے توڑ مروڑ کر رکھ دیا تھا۔ اندر اور باہر کرب کی آگ کے شعلے ہی شعلے تھے۔

اس شہر میں اس کے لیے کوئی گھر نہیں تھا جہاں اسے کوئی ماں پیار سے خوش آمدید کہتی۔ کوئی بھائی اسے جگاتا اور کوئی بہن اس کے کپڑوں کو دھوتی۔ شہر میں ہزاروں چہرے اسے اچھی طرح پہچانتے تھے، لیکن ان چہروں میں اس کے لیے کوئی کشش نہ تھی۔

اس نے شاید ان تمام چہروں کو پہچان لیا تھا۔ اور ان چہروں کے مصنوعی پن کے سامنے حیران کھڑا تھا۔ پھر اپنے کرب کے جنگل سے باہر نکلنے کی بہ وجہ

میں بے خودی کا سہارا لینے پر مجبور تھا۔ ایک ایسی بے خودی جس نے اسے خارج سے کاٹنے کی بجائے اسے اپنے داخلی پن کے ساتھ ایسا منسلک کر دیا کہ وہ بے معنویت کے زہریلے ناگوں کے ڈسنے سے بچ جائے۔ یہ ایک انتہائی خطرناک تجربہ تھا اور ساغر جو اپنے فکر و احساس کے جالوں کے دفاع کی خاطر اپنے وجود کی قربانی دے رہا تھا۔ مجھے بہت قیمتی دکھائی دینے لگا۔

میں اس کی بے ربط باتیں یاد رکھنے کی کوشش کرتا۔ خود فراموشی کے لمحوں میں اس کی شخصیت کا گداز میرے احساس پر منکشف ہونے لگتا اور غم کی صداقت کا شعور آنکھیں کھولنے لگتا، صوفی برق کے آستانے پر جہاں خدا کائنات اور انسان کے بارے میں صوفیانہ بحثیں بڑی طویل ہوتی تھیں۔ اور ترکِ ذات کے تجربوں سے مابعد الطبیعاتی فلسفہ کی کڑیاں ملائی جاتی تھیں۔ ساغر اپنے مست الست رویے کے باوجود وہاں حاضر نظر آتا تھا۔ وہ کیا کچھ سنتا تھا اور کیا کچھ سمجھتا تھا۔ اس وقت ساغر کی شخصیت پر چھائی ہوئی دھند میں یہ سمجھنا بہت ہی مشکل تھا۔ صرف دوستی کا رشتہ ایک ایسا رشتہ تھا جو کسی تجزیے کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ محبت ساغر کی اس اپنائیت کا مظہر تھا جو مجھے اس کے وجود میں بے پایاں نظر آتی تھی۔ لیکن وہ جیسے ہر تعلق کو نظر انداز کر کے اپنے اندر کے سفر کو مکمل کرنے کا عاشقانہ جذبہ رکھتا تھا۔ اس کا میرے ساتھ سب لوگوں سے فاصلہ سا ہوتا تھا جیسے اس کا کسی بھی دنیاوی چیز سے کوئی تعلق نہیں ہے لیکن اندر سے یوں لگتا تھا جیسے جاگ رہا ہے اور اس کی اس بیداری سے بڑا اعتماد جھلکتا تھا۔ میں اس وقت عرفانِ ذات اور

فنائے ذات کے تکنیکی پہلوؤں کو با مل نہیں سمجھتا تھا لیکن فنائے ذات
عملی مشاہدہ ساغر کی صورت میں میرے سامنے ضرور تھا۔

اور اب جبکہ میں اس کے بارے میں اپنی یادوں کو ترتیب د
رہا ہوں۔ مجھے اندازہ ہوتا ہے کہ ساغر ایک انتہائی حساس اور باشعو
تھا اور اسے ورثے میں کوئی ذہنی رشتہ نہیں ملا تھا۔ اپنی اس محرو
شدت سے وہ چیخ اٹھا اور اپنے وجود کی بے معنویت کے حملوں سے بچنے
لیے اس نے خود اختیاری مدہوشی کی راہ اختیار کی۔

اس کے علاوہ پاکستان میں جس مثالی معاشرے کے خواب دیکھے گئے
وہ نہ صرف دھندلا گئے تھے بلکہ ریزہ ریزہ ہو گئے تھے۔ اسے اپنے وجو
احساس کو زندہ رکھنے کے لیے اضافی ہیجان کی ضرورت تھی۔ وہ اندر ہی اند
مست و الست ضرور تھا لیکن اس کی آنکھوں کی مستیوں کے پیمانے خالی
رہے تھے۔

اپنی ڈائریوں میں اس دور کے شب و روز کے چہرے سے گرد
پردے اٹھاتا ہوں تو برطانوی فرم میں ملازمت کے دوران ساغر سے سلسلہ
رابطہ کی کچھ ایسی کڑیاں ضرور ملتی ہیں جو اس کے ذہن کے ارتقاء، سفر کا
بتاتی ہیں۔

وہ بدترین حالات رسوا کن غربت اور آنسو رلا دینے والے دکھوں
جنگل میں صرف اپنے ذہن کے ساتھ موجود تھا۔

میں وہ آوارۂ تقدیر ہوں یزداں کی قسم
لوگ دیوانہ سمجھ کر جسے سمجھاتے ہیں

میکلوڈ روڈ پر افسردہ ہوٹل کی تیسری منزل سے اترتے ہوئے
ظہیر کاشمیری نے دیکھا کہ وہ پھٹا پرانا کمبل اوڑھے سیڑھیوں میں پڑا تھا،
رات کے گیارہ بجنے والے تھے اور سردیوں میں میکلوڈ روڈ پر صرف تانگے
والوں کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔

ظہیر کاشمیری نے پوچھا۔ ساغر تم یہاں کیا کر رہے ہو؟
ساغر نے گہری سوچ کے دریچوں سے جھانک کر ظہیر کاشمیری کو دیکھا
اور سر پر کمبل ڈال کر بولا۔

"میں خیال کی حفاظت کر رہا ہوں۔" ساغر جس خیال کی حفاظت کر رہا تھا وہ
گزشتہ عہد کے اس کردار سے پیدا ہوا تھا جس کی شناخت ساغر کو اپنی ذات
کی تلاش کے نتیجے میں ہوئی تھی۔ وہ کوئی معمولی ذہن نہیں تھا۔ وہ اوائل
تجربے سے مزین تھا اور اس نے اپنی حیات کے مشاہدے میں مکمل ارتکاز کے لیے
اپنے حواس پر کنٹرول کے لیے گرد و پیش سے سارے رابطے توڑ دیے تھے
اس کے بارے میں لکھتے ہوئے بار بار اس بات کا احساس ہوتا ہے
کہ انہوں نے لامعنویت سے معنویت کی طرف سفر میں خاص صوفیانہ طرز احساس
اپنایا اور جبریت کے شعور کی فضاؤں میں اپنی ذات کی تکمیل کے لیے جو راہ

اختیار کی وہ صوفیا کے ان حلقوں کی تعریف اساس ہے جو جبر کے خلاف احتجاج
پرچم بلند رکھتے ہیں اور اپنے بے برکت دور سے نفرت کے اظہار میں اپنی ذات
کو دکھوں کی سولیوں پر آویزاں کر دیتے ہیں۔

ساغر نے اپنی ذات کے کھوکھلے پن سے معاشرے کے کھوکھلے پن
کا ماتم پر جو نیا حال کیا۔ وہ [illegible] گر مرداں ہے۔ اس عہد کے شہر
تنہائیوں کے جس [illegible] کو ساغر [illegible] موتیوں سے سجایا وہ آشنا جان لیوا تھا کہ
کا مادی وجود [illegible] اور وہ بے معنویت کے علاج کے لیے خود
کے آتش فشاں میں کود پڑتا۔ اگر اس کے پاس تخلیقی
نہ ہوتا۔ وہ پتھر ہو جاتا اور مکمل بیگانگیٔ ذات کا نمونہ بن جاتا، مگر وہ خود
مدہوشی کو سینے سے لگاتا تھا۔

اس نے تیزی کے ساتھ ذاتی دکھوں کے دائرہ سے نکل کر اجتماعی
کے شعور کو چھونا شروع کیا تو وہ یہ جاننے کے لیے مدہوشی کے غار
دفن ہو گیا کہ انسان سے انسان کی محبت کس نے چھین لی ہے اور انسان
اتنا پست کیوں ہو گیا ہے کہ ظلمتوں نے سر پیٹ لیا ہے۔

اس نے روپے کو انسانیت پر حاوی دیکھا تو اُسے روپے سے نفرت
جگہی جعلی کلیموں، متروکہ جائداد کی لوٹ کھسوٹ اور اخلاقی بنیاد
محروم تجارت کے فروغ نے فرد کی ذات کو جس طرح طمع و حرص اور
کا قیدی بنا دیا تھا۔ اس سے ساغر کے تصورِ انسان کو شدید ٹھیس پہنچی

ان کی شعری تخلیقات میں اس کی رنجوری وارداتوں کا اظہار واضح ہونے
لگا تھا۔ انہی دنوں وہ بہت موڈ میں تھا اور صوفی برق بھی اس پر بڑے
مہربان تھے۔ بیٹھکوں پر مائیکل آرٹسٹ احمد بھیا، بریگیڈیئر لطیف اور کئی دوسرے
معزز لوگ بھی موجود تھے۔ ساغر نے اپنے لٹے پٹے ترنم میں یہ غزل سنانا
شروع کر دی

"یہ جو دیوانے سے دو چار نظر آتے ہیں" اور جب اس نے یہ مصرع
پڑھا "ان میں کچھ صاحبِ اسرار نظر آتے ہیں" تو محفل میں اک اضطرابی کیفیت
پیدا ہو گئی اور صوفی برق نے تڑپ کر ایک جھرجھری سی لی اور ان کے پھیلاؤ
والی آواز میں لبیں بھی سنائی دی۔

تری محفل کا بھرم رکھتے ہیں سو جاتے ہیں
ورنہ یہ لوگ تو بیدار نظر آتے ہیں
دور تک کوئی ستارہ ہے نہ کوئی جگنو
مرگِ امید کے آثار نظر آتے ہیں
میرے دامن میں شراروں کے سوا کچھ بھی نہیں
آپ پھولوں کے خریدار نظر آتے ہیں
حشر میں کون گواہی مری دے گا ساغر
سب کے سب تیرے طرفدار نظر آتے ہیں

ساغر کی اس غزل نے صوفیوں کی محفل کو رشک باکرہ کر دیا۔ صوفی برق نے
واسکٹ میں سے دس کا نوٹ نکالا اور ساغر کو دیا۔ ساغر نے نوٹ کو ہونٹوں
سے لگایا اور جھومتا ہوا باہر نکل گیا۔

تیسرے دن معلوم ہوا کہ ساغر اور حفیظ قندھاری راولپنڈی چلے گئے ہیں۔ وہ ایک ماہ بعد لاہور واپس آئے تو ساغر کے جسم پر سفید کرتہ پاجامہ تھا اس نے شیو بنوائی ہوئی تھی اور پیروں میں انگوٹھے والی چپل تھی۔ اس کے پاس کافی نوٹ تھے۔

راولپنڈی میں اس نے دو مشاعروں میں شرکت کی تھی اور اخبارو... میں ابھی تک ان مشاعروں کا تذکرہ جاری تھا۔ حفیظ قندھاری نے بتایا ساغر صاحب اب باقاعدہ زندگی بسر کریں گے۔ لیکن چند دنوں کے اندر اندر ساغر صاحب کی شیو پھر بڑھ گئی۔ اس نے کرتہ پاجامہ اتار کر سیا... چادریں تن پر لپیٹ لیں۔ چپل اتار کر پھینک دی اور پہلے سے بھی زیادہ سرجوشی کے ساتھ خود اختیاری مدہوشی میں ڈوبتا چلا گیا۔

اس نے پھر اپنے آپ کو الگ تھلگ کر لیا تھا اور داتا دربار کے عقب میں گھومتا رہتا تھا۔

۱۹۵۴ء کو برطانوی فرم نے لاہور میں اپنا دفتر بند کر دیا اور میں بیکار ہو گیا اور پھر کراچی چلا گیا تو واپسی کے بعد بھی ساغر سے ملاقات نہ ہوئی۔ اب میں سارا سارا دن میکلوڈ روڈ پر گزارنے لگا تھا۔ میں نے بیٹھنے کے... دوبارہ افسانے لکھنے شروع کر دیئے تھے اور ساتھ ساتھ اخباروں رسالوں میں مضمون لکھنے کی کوشش میں تھا کہ مجھے میکلوڈ روڈ سے شائع ہونے والے ایک فلمی ہفت روزہ میں کام مل گیا اور میرا لوہاری اور انارکلی سے شام کو گزر ہوتا اور صبح کو میں رنگ محل سے سواری والے تانگے میں بیٹھ کر میکلوڈ روڈ پر آجاتا۔ جہاں بابا پریز جیتی، اعجاز رضوی، فاروق عادل ... اور ان کی بھی آجاتے تھے۔ افسانوں، مضمونوں، کہانیوں اور شعروں کی باتیں ہوتے تھے لوگ دوستوں کے حلقے میں شامل ہونے لگے اور ایک طویل عرصہ تک ساغر کے صبح و شام کے ساتھ کوئی رابطہ نہ رہا۔ کبھی کبھار حفیظ قندھاری، اکرام اور حنیف ساری مل جاتے تو ہم سگریٹ وغیرہ پینے کے لیے داتا دربار کے پیچھے چلے جاتے تو آتا ضرور معلوم ہو جاتا کہ ساغر یہیں کہیں تھا۔ ایک دو مرتبہ ملا بھی تو مجذوبوں کی طرح گم سم کھڑا رہا۔ نہ کچھ کہا نہ کچھ سنا۔

ایک روز میں پیدل ہی شاہ عالمی سے گزر رہا تھا کہ ڈرائیور نثار مل گیا جو خود بڑا دکھی انسان تھا اور وہ بھی مدہوشی کا رسیا تھا۔ ساغر سے اس کی جان پہچان بھی مدہوشی کے ٹھکانوں پر ہوئی تھی اور جب بھی ملتا تھا ساغر کا حال پوچھتا اور فخر سے وہ ہو کر کہتا۔ خدا کی قسم! میں ساغر کو اکدم ٹھیک کر سکتا ہوں۔ کمبخت اتنا بڑا اچھا شاعر ہے کہ کوئی اس کا جوڑ نہیں۔ لیکن تقدیر دیکھو کہاں سے آئی ہے۔

نثار ڈرائیور نے مجھے دیکھتے ہی فاتحانہ انداز میں کہا

"یونس صاحب! میں ساغر کو گھر لے آیا ہوں۔ وہ بڑے مزے میں ہے میں نے اپنی گھر والی سے کہہ دیا ہے کہ سگریٹ، چائے، روٹی اور ناشتہ پانی اسے سب کچھ دینا لیکن باہر نہ جانے دینا۔" مجھے نثار ڈرائیور کی ہمت پر رشک سا آگیا اور شام کو میکلوڈ روڈ سے واپسی پر نثار کے گھر گیا تو نثار نے کمرے میں اس کے لیے چارپائی پر گردشے سے کڑھائی والی چادر بچھائی ہوئی تھی اور ساغر نثار ڈرائیور کے دھلے ہوئے کپڑے پہن کر بیٹھا تھا۔

ساغر کو دیکھ کر بڑا دکھ ہوا اس نے گھبرا کے چاروں طرف نگاہ

ڈالی اور بولا نثار نے نظر بند کر رکھا ہے۔
ڈرائیور نثار نے کہا۔ تم بادشاہ ہو ساغر۔ تمہیں کون نظر بند کر سکتا ہے
پر ذرا ہوش ٹھکانے پر رہنے چاہیئے۔

"ہاں۔ بہت جلد ٹھکانے پر آجائیں گے"۔ ساغر نے اپنے مخصوص انداز
میں کہا اور نثار کی بیوی نے چائے بھجوا دی۔ میری ہمت نہ ہوئی کہ میں
ساغر کے نثار کے ہاں آجانے کو ایک بہتر فیصلہ قرار دوں۔ وہ نثار کے ہاں
پانچ دن سے تھا اور میں محسوس کر رہا تھا کہ وہ بے چین سا ہے اور بار بار
دروازے کی طرف دیکھتا ہے۔

میں نے پوچھا۔ کوئی شعر لکھے ہیں

ساغر نے سر ہلایا اور کہا: "ابھی تشنہ ہوں اور پتہ نہیں، یہ تشنگی کب دور
ہوتی ہے"۔

میں ساغر سے مل کر گھر واپس آرہا تھا تو اچانک بادل آگئے۔ زبردست
آندھی چلنے لگی پھر ساری رات بارش ہوتی رہی اور دوسرے دن بھی جاری
رہی۔ پانی بازاروں میں جمع ہو گیا تھا

یہ لاہور میں ہونے والی پہلی خوفناک بارشیں تھیں۔ شہر میں مکانات
گرنے کی خبریں سن کر لوگ خوف سے کمروں میں بند ہو گئے تھے اور
ساری ساری رات اذانیں گونجتی رہتی تھیں۔

ساغر صدیقی ان خوفناک بارشوں میں نثار ڈرائیور کے ہاں تھا اور ایک
کونے میں پڑا رہتا تھا۔ سارے کاروبار بند تھے

پیر رود کے پہلو میں خلیفہ ننگا کے ڈیرے پہ ہم شام کو آخر
مل جاتے تھے جہاں اکرام لدھیانوی اور کچھ لوگ آجاتے تھے اور
پھر گپیں لگاتے ہوئے گھروں کو لوٹ جاتے تھے۔ ایک شام
نثار ڈرائیور نے مزے لے لے کر ساغر کے بارے میں بتایا کہ میں اسے ٹھیک
لائن پر لے آیا ہوں۔ میں اب اسے پکی
میں منشی کی نوکری دلوا دوں گا۔ اس شاعری وازی میں کیا رکھا ہے۔ انسان کو پہلے
اپنا روزگار درست کرنا چاہیے تاکہ روٹی تو وقت پر ملے

سمجھ نہیں آتی تھی کہ ساغر نثار ڈرائیور کے اثر میں کیسے آگیا تھا؟ بارشیں
ابھی تک ہو رہی تھی۔ دن کو ساغر مکان کی پچھلی کھڑکی سے گلی میں دیکھتا رہتا اور جب
اندھیرا لاہور شہر کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا تو ساغر نثار ڈرائیور کے تیسری
منزل والے کمرے میں کونے میں دبک جاتا۔ جب بجلی کڑکتی اور بادل زور زور سے
گرجنے لگتے تو ساغر گھٹنوں سے سر اٹھا کر مکان کی چھت کی طرف دیکھتا اور خاموش
ہو جاتا۔ ایک شام بارش بہت تیز ہو گئی تو میں نثار ڈرائیور کے ہاں ہی رک
گیا اور سوچا جب تک بارش بند نہیں ہوتی۔ ساغر سے کچھ باتیں کرتے رہیں
گے

لیکن ساغر کوئی بات کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ وہ ہر بات ہوں ہاں
میں ٹال دیتا اور سگریٹ پھونکتا۔

نثار ڈرائیور نے نیچے اتر کر سٹہ عالمی کی طرف نکلنے والی گلی سے باہر آکر کہا
بارش بند ہوتے ہی میں ساغر کو ٹرکوں کے اڈے پر لے جاؤں گا اور سب
ٹھیک ہو جائے گا۔ میں نے منشی سے ساری بات کر لی ہے۔
دوسرے دن ابھی بارش ہو رہی تھی اور گہری شام کا سناٹا بڑا

ہولناک تھا۔ میں نیلے نبے کے ڈیرے سے اکرام اور حنیف صابری کو شہ پا کر نثار کے گھر آیا تو نثار اپنی بیوی سے کہہ رہا تھا

نیک بخت تم نے اسے جانے کیوں دیا۔ تم نے میری ساری محنت برباد کر دی ہے۔

نثار نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔ دیکھو گھر کی روٹی پسند نہیں کرتا اور نہ جانے اب وہ کہاں دھکے کھاتا ہوگا۔

میری ڈائری میں روشن مسیح کے حوالے سے اس خوفناک بارش والی رات اور ساغر کی کچھ جھلکیاں لکھی ہوئی ہیں۔

۲۶ جون ۱۹۵۴ء کو شہر ویران ہو گیا۔ رات میں ڈھلنے والی شام بڑی تاریک تھی اور شہر میں موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔

ساغر کو اس وقت سر پناہ کی ضرورت تھی اور نہ کسی گھر کی وہ اپنے خیال میں دوبارہ آزاد ہو گیا وہ چلا جا رہا تھا۔

اس کے کپڑے بری طرح بھیگ چکے تھے۔ وہ دیوانوں کی طرح شہر کی فصیل کے گرد بہنے والی بدرو کے کنارے چلتا چلتا کالی دروازے تک آگیا۔ جہاں خاکروبوں کی جھونپڑیاں تھیں۔ وہ کیچڑ اور پانی میں لت پت کچی سڑک پر چلتے چلتے بے حال ہو گیا اور اس نے خاکروبوں کی جھونپڑی کے سامنے اپنے آپ کو گرا دیا۔

بارش تیز ہوتی گئی اور ساغر تمام رات جھونپڑی کے باہر بارش میں بے حال ہو کر پڑا رہا، صبح روشن مسیح نے دروازہ کھولا تو اسے مردہ حالت میں دیکھ کر اس نے ماں کو آواز دی۔ دونوں نے اسے مل کر اٹھایا اور جھونپڑی کے اندر لے آئے۔ اس کے جسم سے گیلے کپڑے اتار کر روشن نے اپنی قمیض اور پاجامہ پہنا دیا تو اس کی ماں نے کہا روشن کوئی پاگل لگتا ہے۔

نہیں ماں! یہ ساغر صدیقی شاعر ہیں اور پتا نہیں ان کو کیا ہو گیا ہے۔ روشن کی ماں نے جلدی جلدی چائے بنائی اور ساغر کو اٹھا کر چائے پلائی تو سب سے پہلے اس کی نگاہ کچی دیوار پر حضرت عیسیٰ کی دار پر لٹکی ہوئی تصویر پہ ٹکی۔ روشن مسیح نے کہا۔

ساغر صاحب۔ ساغر صاحب کیا آپ رات گر گئے تھے۔ ادھر کیسے آ گئے۔

ساغر نے اس طرح دیکھا جیسا کہہ رہا ہو۔ میرا نام ساغر نہیں ہے میں تو کوئی اور ہوں روشن سمجھ گیا۔ اور روشن کی ماں نے ساغر سے کہا۔ بیٹا۔ کوئی فکر نہیں میں تمہاری ماں ہوں۔ تم یہاں رہو جو روکھی سوکھی ملے گی کھایا کریں گے۔

ساغر نے پھر بھی کوئی جواب نہ دیا۔ لیکن وہ روشن مسیح کی ماں کے ہونٹوں سے نکلنے والے لفظوں سے زیادہ اس کے چہرے کی غربت میں چھپی ہوئی محبت کا مفہوم اچھی طرح سمجھتا تھا۔

دوسرے دن روشن مسیح کام پہ چلا گیا تو ساغر اس کی ماں سے کچھ کہے بغیر اس جھونپڑی سے باہر آگیا جہاں حضرت عیسیٰ کی دار پہ لٹکی ہوئی تصویر اور روشن مسیح کی ماں میں کوئی فرق نہیں تھا۔

خاکروبوں کی جھونپڑی سے نکل کر ساغر کہاں چلا گیا تھا۔

میرے حالات کے دائرے بھی بدل گئے تھے اور میں اپنے محور کے گرد گردش میں تھا۔ عارف امان کی یہ دلی خواہش تھی کہ میں فلموں کے لیے کہانیاں لکھنا شروع کروں لیکن میں اپنا ناول گندی گلی چھپوانے کے فکر میں تھا اور ساتھ ساتھ ثاقب زیروی کے ہفت روزہ لاہور میں سب ایڈیٹری کر رہا تھا۔ برطانوی فرم سے ملا ہوا پروویڈنٹ فنڈ ابھی تک ساتھ دے رہا تھا اور جو بھی اس نے ساتھ چھوڑا۔ مجھے ثاقب زیروی نے لائل پور کے ایک ادارے سے منسلک کروا دیا جس نے لاہور سے ایک ادبی ماہنامہ لالہ زار شائع کرنے کے

لیے اپنا دفتر قائم کیا تو میں اس کا ایڈیٹر بن گیا۔

عارف امان، اعجاز رضوی اور احمد نثار روزانہ مجھے ملنے کے لیے "لالہ زار" کے دفتر میں آتے۔ لالہ زار کو ایک مقبول ترین ماہنامہ بنانے کے منصوبے تیار ہوتے۔ میکلوڈ روڈ کے ہوٹلوں میں رات گئے تک محفلیں منعقد ہوتیں اور کبھی دن کے وقت ہم موری دروازہ کے باہر گول چھت والے ریڈنگ روم میں آجاتے جہاں بغیر حیدر نے انچارج کے فرائض سنبھال لیے تھے اور اکثر تھکے رہنے کی عادت سے اس نے ریڈنگ روم کی سیڑھیوں والی کوٹھڑی میں رہائش اختیار کر لی تھی۔

ایک دن میں اکرام اور حفیظ قند هاری موری دروازہ کے باغ میں بیٹھے تھے کہ ادھر سے ساغر صدیقی آتا ہوا نظر آیا۔ حفیظ نے اٹھ کر اسے اپنے پاس بٹھا

اس کے تن پر بہت میلے کپڑے تھے۔ پیر جوتیوں سے بے نیاز تھے اور گنگھریالے بالوں میں میل جمی ہوئی تھی اور خوبصورت آنکھوں میں اداسیوں کی دھند اور زیادہ گہری ہو گئی تھی۔

حفیظ نے پوچھا۔ کہاں چلے گئے تھے۔ ساغر،

ساغر نے اس کی طرف دیکھا اور پھر اکرام کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

تم نے کبھی گھونسلے سے گرا ہوا چڑیا کا بچہ دیکھا ہے۔؟

ہاں۔ پر تم نے یہ اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے اکرام نے اپنے مخصوص ناصحانہ انداز میں کہا۔ اور ساغر ہنس کر بولا۔

اپنی خبر ہو تو اپنی حالت کا بھی پتہ ہو۔ میں تو اپنے خیالوں کا قیدی ہوں۔ اور جب سے حضرت عیسٰیؑ کی سولی والی تصویر دیکھی ہے ایک نئے درد سے آشنائی ہوئی ہے۔

اکرام نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ فضول باتیں نہ کرو اور کوئی شعر سناؤ۔
میں نے اکرام کو منع کیا کہ ایسا نہ کرو اکرام آؤ چل کر چائے پیتے ہیں کہیں۔

ساغر نے جانے سے انکار کر دیا اور باغ سے باہر آتے ہی غائب ہو گیا۔ ساغر نے ہمارے ماڈرن بسیرے چھوڑ دیے تھے اور جہاں وہ پہلے کبھی ملتا تھا وہاں اب اس طرف کبھی کبھار کا پھیرا ہوتا تھا۔

مجھے اگر گردشِ روزگار سے فرصت مل جاتی تو میں اسے تلاش کرتا ہوا تمام مانوس بسیروں کا کونہ کونہ چھان مارتا اور کبھی کبھی وہ اچانک سرکلر روڈ پہ نظر آجاتا تو ایک عجیب سی خوشی میرے احساس میں گنگنا اٹھتی۔ اس کی آنکھیں چہرہ اور جسم اپنی رعنائیوں سے محروم ہو رہے تھے لیکن اس کے لہجے کا پیار اور معصومیت ایک نئے عنوان کے ساتھ ہمکلام ہوتی۔ اور اس سے باتیں کرتے ہوئے یوں محسوس ہوتا جیسے وہ اپنے اندر ہی اندر غائب ہو گیا ہے

اس کا کوئی دوست نہ تھا۔
اس کا کوئی غم خوار نہ تھا۔
اس کا کوئی اپنا نہ تھا

یہی وہ احساس تھا جو ساغر کو بڑی تیزی کے ساتھ اپنے ساتھ ساتھ لیے جا رہا تھا۔ بھرے بستے شہر میں اس کی حالت اس مسافر کی سی تھی جسے بے دردی سے لوٹ لیا گیا ہو۔

نہ کوئی پھول نہ ساغر نہ ماہتاب نہ
بجھا ہوا سا شبستاں ہے زندگی

موسم تیزی سے بدل رہے تھے اور بدلتے موسموں میں اس کا آخری سہارا۔ اس کے افکار و احساس کی دنیا تھی وہ لمبی سیاہ راتوں کی دہلیز پر نوحہ خواں تھا۔

یہ تجربہ بڑا جانگسل تھا جسے وہ اپنے لہو سے رقم کر رہا تھا۔ اظہار کے تمام ذرائع اس کے لیے شجرِ ممنوعہ تھے، علم و ادب کی مسندوں پر قابضین اس کے افکار و احساس سے غافل تھے اور وہ اس بے آسرا پن میں بھی اپنے شاعرانہ جمال کی پُرسوز تصویر بنا ہوا تھا۔ لوگ کہتے تھے اپنے حال سے بے خبر ہے اور وہ کہتا تھا۔

وقارِ انجمن ہم ہیں فروغِ انجمن ہم ہیں
سکوتِ صبح سے پوچھو صبح کی پہلی کرن ہم ہیں

یہ غزل اس نے گرمیوں کی تپتی ہوئی دوپہر کو مجھے ریڈنگ روم کی

وال چھت پر سنائی تھی۔

چھت پر لگی ہوئی شہتوت کی گھنی شاخوں کے نیچے ہم بہت دنوں بعد ملے تھے اور اس نے مڑے تڑے کاغذوں پر لکھی ہوئی مکمل اور نامکمل اپنی غزلیں سنائیں تھیں۔

ریڈنگ روم کی طرف وہ اچانک آنکلا تھا۔ حیدر ساغر کے لیے چائے لینے چلا گیا اور ہم دونوں سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر آگئے۔ ساغر اپنے مشاہدے کی بڑی احتیاط سے حفاظت کر رہا تھا۔ وہ اپنے ان خوابوں سے دستبردار ہونے کے لیے تیار نہیں تھا "میرے خیال کب آزاد ہوں گے۔ جو کچھ نظر آتا ہے اسے ذہن نہیں مانتا اور اسے دیکھتا ہوں اسے دل قبول نہیں کرتا۔ عجیب کشمکش ہے۔ عجیب تماشہ ہے اور میری زندگی بھی ایک تماشہ ہے۔ کچھ سمجھ نہیں آتی کہ میں کیوں پیدا ہوا ہوں یہ میری تقدیر ہے۔ ابھی تک میں کائنات سے اپنے گمشدہ رشتے کو نہیں پا سکا اور اگر شعر میرے دوست نہ ہوں تو میں تمہارے سامنے موجود نہ ہوتا۔"

شہر کے بازار رونقوں کے میلے بنتے جا رہے تھے۔ بڑی عمارتیں اور نئی بستیوں کی تعمیر پورے عروج پر تھی اور ان دنوں مہدی حسن کی آواز میں ساغر کی یہ غزل ہر جگہ سنائی دے رہی تھی۔

چراغِ طور جلاؤ بڑا اندھیرا ہے
ذرا نقاب اٹھاؤ بڑا اندھیرا ہے
وہ جن کے ہوتے ہیں خورشید آستینوں میں

انہیں کہیں سے بلاؤ بڑا اندھیرا ہے
ابھی تو صبح کے ماتھے کا رنگ کالا ہے
ابھی فریب نہ کھاؤ بڑا اندھیرا ہے
جسے زبانِ خرد میں شراب کہتے ہیں
وہ روشنی سے بلاؤ بڑا اندھیرا ہے

مہدی حسن نے ساغر سے یہ غزل کیسے حاصل کی۔؟ یہ ایک معمہ ہے کیونکہ ساغر عرصہ دراز تک کہیں بھی نظر نہیں آیا تھا۔ وہ نہ جانے کہاں رہتا تھا کیسے [illegible] تھا اور کہاں سے آتا جاتا تھا؟ لیکن اس کے تجربوں کی شاعرانہ صداقت یہ [illegible] تھیں جن کے آئینے میں اس کا یہ فنکارانہ احساس زیادہ نکھرا ہوا [illegible] دیتا تھا کہ جس معاشرے میں وہ شاعرانہ جمال کے ساتھ آیا تھا۔ ایک ایسے [illegible] اور اقتصادی نظام میں جکڑا گیا ہے جو دکھ کے ماروں کو دکھ کے سوا کچھ [illegible] دے سکتا۔ اور اس نے ان دکھوں کو اپنی شاعرانہ ننگی کا سنگار بنا لیا تھا۔

انسان سے انسان کی بیگانگی کے گہرے مشاہدے نے اُسے اس [illegible] چونکا دیا کہ وہ خوف زدہ سا ہوگیا۔ وہ انسانوں کے درمیان مردوں [illegible] جنازے جاتے ہوئے دیکھتا تو آنسو پی کر خاموش ہو جاتا لیکن اس کا [illegible] اُبل پڑتا۔

ستم جاگتے ہیں کرم سو رہے ہیں
محبت کے جاہ و حشم سو رہے ہیں
میرے نکتہ سازو! سخن کے خداؤ
پکارو کہ لوح و قلم سو رہے ہیں!

مری اجڑی اجڑی سی آنکھوں میں ساغر
زمانے کے رنج و الم سو رہے ہیں

یہ غزل اس نے اورینٹل کالج کے ایک مشاعرے میں اس وقت پڑھی جب ادب کے نوجوان طالب علم اسے رحم سائیں کے تکیہ سے اٹھا کر لائے تھے مشاعرے کے بعد وہ سائے کی طرح لرزتا ہوا کچہری روڈ سے پیسہ اخبار کی طرف جا رہا تھا کہ میں نے جاگ کر اُسے روک لیا۔ اس نے میری طرف حیرت زدہ آنکھوں سے دیکھا اور کہا۔ میرے ساتھ آؤ۔

ٹکسالی دروازے کے باہر دیام شاہ کے پہلو میں رحم سائیں کے تکیے تک اس نے کوئی بات نہ کی اور جب وہ میرے ساتھ تکیے میں داخل ہوا تو رحم سائیں نے اُسے دیکھتے ہی کہا۔

وہ بادشاہ ہو کہاں چلے گئے تھے؟ ذرا مشاعرے میں چلے گئے تھے۔ ساغر نے اس کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا اور اندھیری کوٹھڑی میں داخل ہوگیا جہاں موم بتی کا کمزور شعلہ کانپ جاتا تھا اور ساغر نے چٹائی کو اپنی چادر کے پلے سے صاف کرتے ہوئے کہا یہاں بیٹھو اس تیرگی میں بھی بڑا حسن ہے اور تم کہاں رہے ہو؟ میں نے پرستش کیتی کی زندگی چھوڑ دی ہے۔ اس نے چونک کر میری طرف دیکھا اور اس کے بعد گہری خاموشی چھا گئی۔ اندھیری کوٹھڑی میں ساغر اور موم بتی دو شعلے [illegible] تھے۔ میں نے چاہا ساغر سے کہوں۔

یار تم کہاں گم ہوتے جا رہے ہو۔ باہر نکلو۔ تم تو یہاں پگھل جاؤ گے لیکن میں کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ اور نہ ہی اسے یہ بتایا کہ باہر مٹنے جلنے والے اس کے بارے میں کس طرح کی باتیں کرتے ہیں۔ میں نے سوچا اُسے سن کر دکھ ہوگا۔

اِس اندھیروں کے عہد میں ساغر
کیا کرے گا کوئی اُجالوں کو !

ساغر اپنے بارے میں فقیر کا لفظ عام استعمال کیا کرتا تھا، اور اب اس
نے جلنے والوں میں ان لوگوں کی تعداد زیادہ تھی جو زندگی سے بچھڑے
ئے تھے اور جس قسم کے معاشرتی نظام کی جڑیں مضبوط ہوتی جا رہی تھیں
سے ڈرے ہوئے لوگ گھنٹوں رحم سائیں کے تکیے میں ساغر کے گرد
بیٹھے رہتے تھے ان کے لیے ساغر کے پاس محبت بھری نظروں اور پیار بھرے
بول کے سوا کچھ نہ تھا۔

میں دوسرے تیسرے رحم سائیں کے تکیے میں چلا جاتا اور مجھے یہ جان کر
دکھ ہوتا۔ بہت سارے سفید پوش اس کا کلام خریدنے وہاں جاتے
تھے۔ اور اصلاح کے بہانے اسے رحم سائیں کے تکیے سے جاتی
وری کے ہوٹلوں میں لیے پھرتے۔ ان سے دامن چھڑا کر پھر رحم سائیں
کے ڈیرے پر آ جاتا اور پھر کئی کئی دن اس اندھیری کوٹھڑی سے باہر نہ نکلتا۔

اس دوران میرے لیے یہ جان لینا کوئی مشکل نہ تھا کہ ساغر ایک مستقل
جان کی زد میں آ چکا ہے اور اپنے ذہن کی دنیا آباد کرنے کے
ردا ہے خود اختیاری مدہوشی کے غلبے میں آ جاتا تو یوں لگتا جیسے وہ اپنے ذات
سمٹ آیا ہو۔ اور جن تنہائیوں کی آغوش میں لیٹا ہوا تھا وہ اس معاشرے

اس نے طویل خاموشی کو توڑ دیا اور کہا "بابر میرے لیے صرف ملامتیں
میرے پاس زخمی احساس ہے اور خرید و فروخت کے بازار
تو میرے پاس کچھ بیچنے کے لیے ہے نہ خریدنے کے لیے"

"لیکن یہ تو کوئی اچھی بات نہیں ساغر کہ تم اپنے آپ کو الگ کر لو"
سوال پر اس نے پھر خاموشی اختیار کر لی اور تھوڑی دیر چھت کی طرف
کر بولا۔ اس کا سایہ

"وہ بڑی مہربان ہے اور جہاں تک خود کو الگ کرنے کا سوال ہے
یہ سب بے ارادہ ہے اور میں نہیں جانتا میرے ساتھ کیا ہونے والا

اچانک رحم سائیں نے دروازے میں قدم رکھا اور ڑے رکو
جاتے ہوئے بولا۔

"ساغر بابا! کسی چیز کی ضرورت ہو تو آواز دے لینا۔"

"بھلا ہو بابا! فقیر کو کسی چیز کی ضرورت نہیں، دھوئیں کا سامان
ہے۔" یہ کہہ کر ساغر نے افغانی پیالیوں میں تمام چینی کی چینک سے
انڈیلی اور اپنے آپ سے باتیں کرنے لگا۔

بیٹے اور بیٹیاں تانگوں کے پیچھے بھاگ کر خیرات مانگتے ہیں اور
آسمانوں کی طرف دیکھتے ہیں۔ یہ منظر پھیلتا جا رہا ہے۔

میں چائے پی کر رحم سائیں کے تکیے سے باہر نکلا تو ساغر گورد
قبرستان تک مجھے چھوڑنے آیا اور واپس جاتے ہوئے بولا۔
"کبھی ادھر سے گزر ہو تو فقیر کے حال پر نظر ڈالتے جانا۔"

ے اس کی پہلی بغاوت کی علامت تھیں جہاں انسان شعورِ ذات سے
محروم کر دیئے جاتے ہیں اور ان کی انسانیت رفتہ رفتہ ختم ہو جاتی تھی۔
خود اختیاری مدہوشی کا یہ تجربہ ساغر کی زندگی میں گہرے اثرات کا حامل
ہے لیکن مدہوشیوں کے طویل عمل میں اس کا شاعرانہ شعور اتنی تیزی سے نکھرا
کہ اس کا ایک ایک شعر زندگی کی حقیقتوں کا آئینہ نظر آتا ہے۔

یہ اپنی ذات سے اس کا پہلا عہد تھا، ایک وفا شناس انسان
کا عہد۔ جس نے خود کو غلیظ خواہشوں اور خود غرض جذبوں سے ترتیب
پانے والی سوسائٹی سے الگ تو کر لیا تھا لیکن اپنے فکر و خیال کی رعنائیوں
کو فیاضی سے عام کرتا رہا۔ اس کی شاعری میں یاسیت کا بہاؤ ان انسانوں
کی بے چارگی کا مظہر بنتا گیا جو اپنی تخلیق سے بے خبر تھے اور انسان
ہونے کے احساس سے عاری ہوتے جا رہے تھے

میں بھی کعبے سے نکالا ہوا اک بت ہی تو ہوں
ذوقِ تخلیق تجھے کیسے ستم آتے ہیں،
جس زباں میں بے کسوں کی بات ہو
اس زباں میں گفتگو کرتے چلیں

وہ صرف ایک شاعر تھا۔ شاعر جو اپنی داخلی احساسات کے حوالے
زندگی کی کراہتوں، نفرتوں اور حقارتوں کا بھرپور مشاہدہ کر رہا تھا اور یوں
لگتا تھا جیسے اس نظامِ شمسی میں حرکت و تغیر کی لامحدود صورتوں کو اپنے
اندر جھانکتے ہوئے دیکھ کر وہ اپنے وجود کے عرفان کی ان سرحدوں تک
پہنچ چکا تھا۔ جہاں اس کے سامنے ہزاروں سوالوں کے پراسرار جہان سے
ہو گئے تھے اور ان کے جواب میں اسے صرف تضادات دکھائی دیتے جن کی گرہیں کھولتے
ہوئے اس کا اپنا ذہن الجھ گیا تھا۔

اسے قدم قدم پر اپنی ہی تذلیل کے مناظر نظر آتے تھے۔ فٹ پاتھوں پر
صورتِ سوال بن کر بکھرے ہوئے نحیف و نزار اور شرفِ انسانی سے محروم وجود
اسے یہ سوچنے پر مجبور کرتے تھے کہ وہ انسان کے بارے میں سوچے جو مطلبوں
کی کرفیاضیوں اور نیکیوں سے عاری ہو گئے ہیں اور بھوک ننگ اور ذلت نے
انہیں بہت ہی حقیر مخلوق بنا دیا ہے۔

اس کی نظر جب اس کے پس منظر میں بھٹکنے لگی تو اسے اپنا وجود
خطرے میں نظر آنے لگا۔ اس کے باطن میں کئی مد و جزر پیدا ہونے لگے۔ وہ
اپنے انسان ہونے کو بھی المیہ سمجھنے پر مجبور ہو گیا۔ وہ ذوقِ تخلیق
پر طنز تو نہ کر سکا لیکن اپنے آپ پر برہم ہو گیا اور یہ برہمی اسے گرد و پیش
سے تیزی کے ساتھ الگ کرنے لگی۔

سردی، گرمی، بھوک، احتیاج اور ہر قسم کی محرومیوں میں پھنسا ہوا ساغر
اپنے اندر پوری طرح کھو گیا اور جن تجربات کی بھٹی میں پڑا تھا، اسے اپنے
تخیل کے نہاں خانوں میں بڑی فنکاری سے ترتیب دے رہا تھا۔

دیکھنے والی آنکھیں اسے مسلسل خود اختیاری مدہوشی میں دیکھ کر اپنا
مزاج بدل دیتیں اور اس پر فرار کا لیبل لگا دیا لیکن وہ فرار کسی صوفیانہ
منزل کی طرف بڑھ رہا تھا، وہ کوئی عام تجربہ یا واقع نہیں تھا۔ لیکن وہ اپنی
ذات کی تکمیل کے بہت ہی پراسرار پروسس میں داخل ہو چکا تھا وہ
اپنی ذات میں جس قدر جھانکتا چلا گیا۔ اتنا ہی نفع و نقصان کی دنیا سے
دور ہوتا چلا گیا۔ وہ کبھی کبھی بے ارادہ جم سائیں کے تکیے سے نکلتا اور
شہر کی سڑکوں پر نظر آتا تو ہر کوئی اس کے لیے پند و نصائح کے دفتر کھول دیتا۔
اس سے بے پناہ ہمدردی کا اظہار کرنے والے اسے اس مادی تباہی کا
احساس دلانے کی کوشش کرتے تو وہ درد بھری مسکراہٹ کے ساتھ

آگے بڑھ جاتا۔ وہ بہت کم باتیں کرتا۔

" فقیر اپنے ہی سجدوں کے نشان ڈھونڈ رہا ہے
میں نے منصور کو سولی پہ لٹکے ہوئے دیکھا ہے
مجھے اپنے قدموں کے نیچے انسان کے کسی پرشکوہ ماضی کی سرسراہٹ سنائی دیتی ہے
اور میں ان لوگوں کی صدائے بازگشت ہوں، جو شہادت پاتے ہیں"

رفتہ رفتہ شعروں سے اس کا ہر رشتہ منقطع ہو رہا تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ علم و ادب کی سندیں سجائی جا رہی تھیں اور علم فروشوں کے سینوں پہ تمغے آویزاں کیے جا رہے ہیں لیکن اسے ان مسندوں اور تمغوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کے جسم سے لپٹے ہوئے بوسیدہ کپڑوں سے بدبو آتی تھی اور اس کے ہاتھوں اور ناخنوں پر میل کی تہیں جمی ہوتی تھیں اسے نہائے ہوئے مہینوں گذر جاتے تھے اس کی نیندیں نرم تکیوں سے محروم تھیں اور جہاں تھک جاتا لیٹ جاتا۔ اس کی خود کلامی زیادہ بے ربط ہوتی گئی اور رات کو رحم سائیں کے تکیے سے نکل کر شہر کی سڑکوں پر چلتے ہوئے وہ اچانک جدا ہو جاتا۔ میری طرح ساغر کو روزانہ کئی لوگ ملتے تھے جو اس کے اندر چھپی ہوئی نیکیوں سے پیار کرتے تھے۔ انہیں ساغر کی لٹی پٹی زندگی میں اپنی زندگی نظر آتی تھی اور وہ اسے اپنے احساسات کے ترجمان کی حیثیت سے بے پناہ چاہتے تھے۔ انہیں اس بات سے کوئی غرض نہ تھی کہ ساغر کے جسم سے بوسیدہ کپڑے چمٹے ہوئے ہیں اور اس کے بالوں میں خاک ملی ہوئی ہے۔ وہ تو ایک لرزیدہ روح کی بے تابیوں کے المناک نغموں کے گرویدہ تھے۔ اور زمانے بھر کی نفر

سے دامن چھڑا کر اس کے سائے میں آجاتے تھے۔

وہ صرف ان سے باتیں کرتا تھا اور وہ بڑے احترام سے اسکی باتیں سن لیتے تھے انہوں نے ساغر سے کبھی یہ نہیں کہا تھا کہ وہ زندگی سے بھاگ کر رحم سائیں کے تکیے میں کیوں چھپ گیا ہے۔ اور اس نے اپنے آپ کو مدہوشی کے حوالے کر دیا ہے وہ تو اس سے زمانے کے چلن کی خبر سنتے تھے اور اس کی اداس آنکھوں میں زندگی کو سلگتے ہوئے دیکھتے تھے۔ وہ اس کی جرأتوں کی گہرائیوں میں تو نہیں جا سکتے تھے اور نہ ہی اس کے خیالوں کی پرواز کا ساتھ دے سکتے تھے لیکن ساغر کی ٹوٹی پھوٹی شخصیت میں جو نکھار اور رچاؤ تھا وہ ہر ٹھکرائے ہوئے فرد کے لیے رحم محبت اور پیار کا اعلان بن جاتا تھا۔ اس کے اندازِ فکر میں ڈھلے ہوئے کئی چہروں کو میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ شبیر بجلی والا ہمیشہ ہاتھ میں پلاس اور پیچ کس رکھتا تھا ساغر کے پاس بیٹھ بیٹھ کر بجلی کو ہی ایک آخری سچائی سمجھ بیٹھا تھا۔

" بجلی۔ بڑی چیز ہے۔ تجلی اس کا ماخذ ہے اور کائنات میں حرکت کا منبع یہی بجلی ہے اور جس طرح بجلی کا کرنٹ جلا کر راکھ کر دیتا ہے۔ اگر بجلی سے سامنا ہو جائے تو کسی چیز کے بچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن بجلیوں سے کھیلنا آسان نہیں ہے۔ رحم سائیں کے تکیے میں زیادہ تر وہ لوگ تھے جنہیں معاشرے اور خاندان نے اپنے آپ سے الگ کر دیا ہوا تھا اور بیگانگیٔ ذات کے عمل کے بہاؤ میں تیزی سے بہہ رہے تھے۔ بلو نامی نوجوان جسے مدہوشی کے عمل نے ہڈیوں کا ڈھانچہ بنا دیا ہوا تھا۔ کبھی کبھی ترنگ میں آکر ساغر کے قدموں پر جھک جاتا اور بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے

لگتا۔ منتیں کرنے لگتا۔

"بابا! میری ہستی واپس کر دو، میری ہستی کو واپس کر دو۔ دیکھو مجھے ان سے بچالو۔ یہ بڑے ظالم ہیں۔ مجھ سے میرا سب کچھ چھین رہے ہو۔"

ساغر اسے اپنے قدموں سے ہٹا کر تکیے سے نکل جاتا اور مجھے اسے تلاش کرنے میں کئی کئی دن لگ جاتے۔ پھر وہ اچانک رحم سائیں کے تکیے میں داخل ہوتا تو رحم سائیں اٹھ کر ساغر کے پاس چلا جاتا۔

کیا روٹھ گئے تھے، ساغر؟

ساغر گردن ایک طرف جھکا کر کہتا۔ کسی کو کیا پتہ کہ اپنی تلاش کتنا کٹھن مرحلہ ہے۔

ساغر بڑی تیزی کے ساتھ پہلے تو اپنی ذات سے علیحدگی کا شکار ہوا پھر اچانک ذات کے شعور سے ہی عاری ہو گیا۔

مدہوشی اور مسلسل مدہوشی نے اس سے ہوش و حواس چھین لیے وہ اب اکثر رحم سائیں کے تکیے میں پڑا مل جاتا۔ اس نے خود کلامی بھی بند کر دی تھی۔ اس حقیقت کو بھی بھول گیا تھا کہ وہ ساغر صدیقی ہے۔

بھوک اور پیاس سے بے نیاز ساغر کی حالت دیکھنے والی تھی ایک روز میں نے اس گم سم ساغر کو رحم سائیں کے تکیے سے اٹھایا اور زبردستی باہر لے آیا۔ گوروں کے قبرستان کے قریب سے گذر رہے تھے کہ موسیقار مبارک علی نے دیکھ لیا۔ مبارک علی کی حساس طبیعت کو بڑی ٹھیس لگی۔ پتہ نہیں کہ مبارک علی کی ماں سے بھی زیادہ محبت نے اس پر کیا جادو کیا کہ رحم سائیں کے تکیے کی طرف جانے کی بجائے وہ مبارک علی کی بیٹھک میں آگیا۔

فقط اک ہات میں ٹوٹا ہوا ساغر اٹھانے سے
لرز اٹھا ہے اے یزداں! تری عظمت کا مینارا

مبارک علی کی بیٹھک شاہی محلہ میں لوگزہ پیر کے سامنے تھی جہاں چوبیس گھنٹے فن کاروں اور فن کے پرستاروں کی محفل جمی رہتی تھی۔ مبارک نے سب سے پہلے اوپر والے کمرے میں ساغر کا ٹھکانا بنا دیا۔

ساغر یہاں آکر بھی مطمئن نہیں تھا۔ اگرچہ مبارک علی مدہوشی کے لوازمات میں کوئی کمی نہ آنے دیتا۔ اسے زبردستی نہلاتا۔ اس کے لیے بہتر سے بہتر کھانے کا بندوبست کرتا اور کبھی کبھی ساغر اوپر والے کمرے سے اتر کر نیچے آجاتا۔ مبارک علی سرمنڈل پکڑ کر راگ بجے بجے دھنی چھیڑ دیتا۔ ساغر بڑے انہماک سے بجے بجے دھنی سنتا اور موسیقی کے زیر و بم کے ساتھ اس احساسات میں رت جگا کی کیفیت بھر جاتیں۔

مبارک علی کے ہاں آکر ساغر نے دوبارہ شعر کہنے شروع کر دیئے تھے۔ ان دنوں مبارک علی انور کمال پاشا کی فلم دو آنسو کا میوزک ترتیب دے رہا تھا اور ایک گیت کا مکھڑا سروں میں نہیں ڈھل رہا تھا۔ یہ گیت پاشا کے دربار کے ایک شاعر نے لکھا تھا۔ ساغر نے مبارک علی کی الجھن دیکھی تو کاغذ قلم پکڑ کر نیا گیت لکھ دیا۔

مبارک علی یہ گیت سن کر پھڑک اٹھا اور اسی لمحے اس گیت کی دھن مکمل ہو گئی۔ پاشا نے یہ گیت سنا تو اس نے فیصلہ کر لیا کہ سارے گیت ساغر ہی لکھے گا اور گیتوں کی سچوایشن لکھ کر ساغر کو بھجوا دیں۔

پاشا نے پہلے گیت کا معاوضہ ۔۔ ۵ روپے دے دیا۔ مبارک علی نے ساغر کے لیے نئے نئے کپڑے جوتا اور گھڑی خریدی اور باقی روپے اس کی جیب میں ڈال دیئے۔ ساغر اس وقت بیٹھک سے اترا اور اس کے قدم اسے رحم سائیں کے ہاں لے گئے

اس نے اپنے کپڑے اتار کر بلو کو دے دیئے۔

اور سارے پیسے خرچ کر دیئے۔ کھانا، سگریٹ، چائے منگوانے کے بعد جو کچھ بچا اس نے لوگوں میں تقسیم کر دیا اور صبح کے وقت بیٹھک میں واپس آیا تو مبارک علی اسے دیکھ کر غمزدہ ہو گیا لیکن اس نے کچھ نہ کہا۔ صرف یہ کہہ کر خاموش ہو گیا: "ساغر اگر دوسرا گیت مکمل نہ ہوا تو میری عزت خاک میں مل جائے گی۔" ساغر نے کوئی جواب نہ دیا اور اوپر کمرے میں سونے چلا گیا۔ دوپہر کو نیچے آیا تو اس نے نغمہ کا پرزہ مبارک علی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"یہ لیں۔ اگر اس سے آپ کی عزت بن سکتی ہے تو میں حاضر ہوں۔" مبارک علی بہت خوش ہوا۔ اس نے فوراً ساغر کو ساتھ لیا اور پاشا کے ہاں پہنچ گیا۔ پاشا نے گیت سنا تو اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ پھر اپنی جیب سے پانچ سو روپے نکال کر ساغر کو دیتے ہوئے بولا۔

"قبول کریں!" "یہ معاوضہ نہیں نذر ہے۔"

ساغر نے پانچسو روپے پکڑ لیے اور پھر فوراً ہی واپس کرتے ہوئے بولا۔

"آپ اپنے پاس رکھ لیں۔ میرے پاس رہیں گے تو مجھ پر عذاب آ جائے گا۔ میں روزانہ آ کر پانچ روپے لے جایا کروں گا۔"

ساغر پانچ روپے لے کر چلا گیا اور پھر کبھی واپس نہ آیا۔ دوسرے شاعروں نے کہا: "ساغر دیوانہ ہے کام کاج سے ناکارہ ہو چکا ہے۔ آپ کب تک انتظار کریں گے

اس کے بعد مبارک علی کی بیٹھک کی طرف جانے والے راستوں کو بھی بھول گیا۔ وہ ایک بار پھر فلمی دنیا کی چمک دمک سے گھبرا کر سوگوار جسموں اور غم افروز شاموں کی دہلیز پہ آ کر رک گیا۔ اس نے معاشرتی ذلت و رسوائی کے سارے غم اپنے دل میں چھپا لیے اور ملامت کا لباس پہن کر عزت و توقیر کے فرسودہ نظام کے سامنے باغی بن کر کھڑا ہو گیا۔

اس نے اپنی ذات کی تکمیل کے لیے اپنا تخلیق کردہ راستہ پسند کر لیا تھا۔ غم کی دنیا ہی اس کا لباس بن گئی تھی۔

علم و ادب کی محفلوں میں اس کا نام تحقیر اور استہزا کی علامت بن گیا تھا اس کے پیر تپتی ہوئی سڑکوں پر چلتے چلتے بجھے ہوئے انگاروں کی طرح ہو گئے تھے سنہری ساری رنگت جل گئی تھی۔ بالوں کی رعنائیاں مٹ گئی تھیں اور اس کی بڑی بڑی مست آنکھیں دور دور دیکھتے دیکھتے کے زاویے بن گئی تھیں اس کی ہڈیوں پر گوشت چیتھڑے کی طرح کسا جا رہا تھا۔

پتا نہیں وہ کیا دیکھ رہا تھا اور کیا سوچ رہا تھا۔ وہ اپنے اندر کے تجربوں کو اندر اندر ہی محفوظ کر رہا تھا۔ اب اس سے ملاقاتیں کم کم ہونے لگیں۔ سیاہ چادر اوڑھے قریب سے کچھ کہہ کر گزر جاتا۔ اور ملنے جلنے والوں کی پہچان بھی ختم ہو گئی۔ کبھی اس کے جسم پر کوئی خطرناک پھوڑا ہو جاتا اور کبھی اس کے زخم پیروں سے خون اور پیپ بہنے لگتی۔ اس نے اب اپنے آپ کو داتا دربار کے پیچھے کوٹھڑی پیر تکیے موراں کی چار دیواری میں مقید کر لیا تھا۔

میں حفیظ قندھاری، اکرام لدھیانوی یا شبیر علی بجلی والا آ کے ملتے کھڑے کھڑے پیر جاتے تو وہ منہ دوسری طرف کر کے بڑبڑانے لگتا۔

اس کی بے ربط باتیں بالکل سمجھ نہ آتیں۔ شاید اسے یہ پہلی یاد نہ تھا کہ اس کا نام ساغر صدیقی ہے۔"

داتا دربار کے پیچھے گھوڑا ہسپتال کی طرف جانے والی سڑک پر فٹوں سے یک ڈھیر پر بیٹھا تھا کہ کسی نے گداگر سمجھ کر چونی اس کے ہاتھ پر رکھ دی۔ ساغر نے فوراً ہی چونی سڑک پر پھینک کر کہا۔ فقیر کی جھولی میں اپنے سانپ کیوں پھینکتے ہو۔۔۔۔۔۔

اسی طرح بہت دنوں بعد وہ کھڑکھڑی پیر سے نکل کر ایک پر رونق بازار کے فٹ پاتھ پر ڈیرہ جمائے بیٹھا تھا کہ ایک ادب نواز نے اسے دیکھ کر اپنی کار روک لی اور باہر نکل کر اس کے پاس آ گیا۔

"ساغر صاحب آپ یہاں بیٹھے ہیں۔ یہ تو فٹ پاتھ ہے۔

اس نے آنکھ اٹھا کر دیکھا اور کہا۔ جانتا ہوں۔

کار والے نے پوچھا۔ لیکن آپ کا گھر کہاں ہے؟

"ساری دنیا میرا گھر ہے۔ کیا مکان کیا سرائے کیا فٹ پاتھ۔

ساغر کا جواب سن کر پوچھنے والے نے ایک اور بات کہہ دی۔

"آئیے! میں آپ کو لے چلوں۔

ساغر نے پوچھا کہاں؟

جہاں آپ جانا چاہیں۔

"لیکن یہاں میں بہت مزے میں ہوں۔" یہ کہہ کر ساغر نے منہ دوسری طرف کر لیا۔ ساغر نے اس معاشرے سے منہ موڑ کر جن تجربوں کی سولی پر اپنی ذات [illegible] لٹکایا ہوا تھا وہ اس کے شاعرانہ احساسات ہی کا ایک حصہ تھے اور جن زخمی احساس کے ساتھ اس کی زندگی کا آغاز ہوا تھا اس نے اسے اتنا غم شناس ک

بنا دیا کہ غم ہی اس کی کائنات بنتا چلا گیا اور اگر وہ غم شناس نہ ہوتا تو اس ذلت و رسوائی کو برداشت کرنے کی کوشش میں ہی ہلاک ہو جاتا۔ اس کی تباہ حال زندگی دیکھنے والوں کے نزدیک ایک طعنہ بن گئی تھی اور یوں ایک تخلیق کار کا دنیا سے کٹ جانا عام طور پر جنون کے لیے خودکشی کے مترادف تھا۔ کہ وہ زندگی کی حقیقتوں کا سامنے کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتا۔

لیکن یہ حوصلہ صرف ساغر میں تھا کہ انسان مسلسل ایک کرب اور پر ملال افسوں میں گم ہو جائے۔ دیکھنے والوں کی نظر میں ساغر کا نحیف و نزار جسم ایک تہس نہس شعور کی کہانی کا عنوان لیکن باطنی طور پر وہ ایک سچے صوفی کی طرح فنائے ذات کے عمل میں تھا جہاں عقل و بصیرت تک ساتھ چھوڑ دیتی ہے اور صرف احساس کے حوالے سے ایک وجود قائم ہوتا ہے۔ شعورِ انسانی صرف جوہر خیال کا متلاشی ہوتا ہے۔ خیال کے اعتماد کا ایک نیا افق ابھر کر سامنے آ جاتا ہے اور یہ اعتماد خاص طور پر ان باصلاحیت افراد کے کردار کا حصہ ہوتا ہے جنہیں اس وسیع و عریض کائنات میں صبح و شام کی گردش کے اسرار میں اپنے وجود کا مکمل احساس ہوتا ہے اور انہیں کسی عظیم تر مقصد کی جستجو ضرور ہوتی ہے۔ یہ دونوں حالتیں ساغر کو درپیش تھیں اور اسے یہ بھی معلوم تھا کہ منزلِ انجانی ہے اور راستہ دشوار ہے۔ لیکن اس نے اپنے خیال کی تکمیل کے لیے جس شجاعت بھرے انداز میں جدوجہد کی یہ اس کا حصہ ہے۔ جستجوئے حیات کی دشواریوں کا سامنا کرنے کے لیے اس کے پاس صرف تخلیقِ شعر کا ہتھیار تھا اور جس خارجی اور داخلی کشمکش نے اس کے اندر ہلچل مچا رکھی تھی۔ ایک خطرناک بحران تھا اور ساغر اس تجربے کو عاشقانہ تجزیوں کے ساتھ ابھار رہا تھا جس کی تکمیل کے بعد انسان کائنات اور

اپنے درمیان گمشدہ رشتوں کو پالیتا ہے اور لامحدود سے لامحدود میں آجاتا ہے

ساغر اپنے خیال کی وارفتگیوں کے خوبصورت جنگلوں میں کئی بر
یک رہا۔ اس غیر معمولی تجربے کی چھاپ اس کی ابتدائی تخلیقات میں بھی
نظر آتی ہے، جن میں وہ حیرت کے دروازوں پر بے باکانہ دستک دیتا
ہوا دکھائی دیتا ہے۔ صوفیا کے نزدیک حیرت شعورِ ذات کا پہلا مرحلہ ہے
اور ظہورِ وجود کی علامت ہے۔ حیرت عقلی حواس اور حاصل شدہ معلومات
پر چھا جاتی ہے۔ راہِ جستجو میں حیرت زدہ ہونے والا اپنے اندر ہی اندر ڈو
چلا جاتا ہے اور جب اپنی ذات سے بھی دستبردار ہو جاتا ہے تو تب وجدا
اس کی راہنمائی کرنے لگتا ہے۔

ایک ایسے معاشرے میں جہاں ساغر نے انسانی احترام اور آزادی کے
اعلیٰ جذبوں کی تکمیل کے لیے شاعرانہ ولولوں کے ساتھ زندہ رہنے کی آ
کی تھی۔ وہاں آزادی اور احترام کے سارے خواب کچی طرح چکنا چور ہ
رہے تھے۔ افراد کی شخصیت کی نشوونما کے امکانات کو دہرے تہر
استحصالی طبقوں نے مکمل طور پر نیست و نابود کر دیا تھا۔ ملکیتی نظام کے ہا
محروم طبقوں کی زندگی جانوروں سے بھی بدتر بنتی جا رہی تھی۔ ان کی نجات
ساری راہیں مسدود تھیں اور تکمیلِ ذات کے جوہر کی محرومی نے افر
انسانیت کی انتہائی پستیوں میں پھینک دیا تھا۔

ساغر نے اپنی ذات کی حفاظت کے لیے جو سب سے الگ تھلگ
انداز کا صوفیانہ رویہ اختیار کیا تھا وہ رائج الوقت سماجی و معاشرتی قو
سے مکمل انحراف کی صورت تھی اور وجود و ذات سے اس کا عشق ان آ

وضاحت تھا جو ملکیت کے نظام کی نفی کرتی ہیں اور انسان کے لیے ہر قسم کے جبر
سے آزادی کا پیغام بن جاتی ہیں۔

نہ اسے واعظوں کی تبلیغ سے کوئی سروکار تھا اور نہ مُلاں کی اذان سے اس کے
دل میں تجلّی جلتی تھی۔ وہ فقیہہِ شہر کی عبا و قبا کو بھی خاطر میں نہ لایا اور عشق کی راہوں
میں اپنے تارِ گریباں بکھیرتا رہا۔

اس پر جو بیت رہی تھی اس کا برداشت کرنا شہادت گہِ مرداں میں
رفتہ رفتہ قدم رکھنا ہے۔ خود اس کی اختیاری مدہوشی ایک مستقل مدہوشی میں
بدل گئی تھی۔ وہ داتا گنج بخش کے مزار کے سرہانے والی نیم تاریک جھونپڑیوں
میں سے ایک کا سایہ بن کر رہ گیا تھا اور میں کبھی کبھی اس طرف سے گزرتا
اور ان جھونپڑیوں میں جھانکتا تو بوسیدہ دیواروں سے لپٹے ہوئے سا ... ن
میں ساغر کا سایہ دیکھ کر لرزتا تھا --- میں اسے آواز دیتا اور نم آلود آنکھوں
سے میری طرف دیکھ کر پھر کہیں کھو جاتا۔

ان جھونپڑیوں میں رہنے والے اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے
تھا کہ اس عجیب و غریب اور حیرت انگیز تجربے کے ابتدائی مرحلوں میں جب
اس کے حواس پوری طرح معطل نہیں ہوئے تھے اس نے اپنی دگرگوں حالت
اور اندرونی کشمکش کا اظہار بعض شعروں میں بھی کیا تھا کہ

اس راہزنِ حیات زمانے سے دور چل
مر بھی گئے تو جادۂ صحرا بری نہیں
ساغر کے ساتھ چل کے کبھی میکدے میں سن
اتنی حدیثِ بادہ و ساغر بری نہیں

جب وہ جاننے والوں کے ذہن سے پوری طرح محو ہوگیا اور لوگ اسے بھول گئے ایک ایسا وقت بھی آیا کہ اس پر بلاؤں کی انتہا ہوگئی۔ اس کا سارا جسم خون اور پیپ سے بھرے ہوئے زخموں میں تبدیل ہوگیا۔ اور اسے داتا دربار کے پیچھے ایک کوٹھڑی میں کوڑھ زدہ انسان کے روپ میں دیکھ کر میرا رُواں رُواں کانپ اٹھا۔

میں نے حفیظ قندھاری سے مشورہ کیا اور ہم دونوں اسے ہسپتال لے جانے کے لیے کوٹھڑی میں آئے تو وہ ہمیں بالکل پہچان نہ سکا۔ سوالوں کا جواب دینے کی کوشش کرتا تو اس کی بے ربط باتوں سے کچھ اخذ کرنا مشکل تھا۔ میں ٹوٹا ہوا تارہ ہوں۔

میں کون ہوں اور وہ کون ہے

سائے پھیل رہے ہیں۔ احساس ریزہ ریزہ ہے۔ لال ٹوپیوں والے آئیں گے اور نیزوں پر سروں کو سجائیں گے۔

کچھ فقرے اس کے لبوں تک آنے سے پہلے ہی غائب ہوگئے۔ وہ اپنے زخم زخم جسم کو گھسیٹ کر ایک کونے میں ہوگیا اور اس نے اپنے چہرے پر گندی بوسیدہ بوری ڈال دی۔ جو اس کا بستر تھی۔

حفیظ کا خیال تھا کہ اب اس کا زندہ رہنا مشکل ہے لیکن ہم نے اسے یہاں سے اٹھا کر ہسپتال لے جانے کا پروگرام بنایا اور دوسرے دن ٹیکسی لے کر وہاں پہنچے تو ساغر موجود نہیں تھا اور کسی کو بھی علم نہیں تھا کہ وہ اس وقت کہاں ہوگا۔

جس کو انساں کی موت کہتے ہیں
اس قیامت کی ابتدا میں ہوں

پاسپورٹ پر درج تاریخوں کے مطابق فروری ۱۹۵۶ء میں ابھی لالہ زار کے چار شمارے ہی شائع ہوئے تھے کہ اس کا ڈیکلریشن مالکوں نے ہاشمی صاحب سے واپس لے لیا اور وہ اپنا دفتر چھوڑ کر فیصل آباد چلے گئے۔ میرے لیے یہ ایک حادثہ سے کم نہیں تھا۔ بیکاری کا پھر تیر چل گیا تھا اور ناول گندی گلی ایک بار پھر چھپنے سے رہ گیا تھا

جنوری ۱۹۵۷ء کو دیانند کالج حصار سے میرے ایک کلاس فیلو نے مجھے لکھا کہ حصار میں دیانند کالج کا سالانہ کنونشن ہے اور تمہیں یہاں آکر سکون ملے گا۔

پاسپورٹ تیار تھا۔ میں نے بمبئی، علی گڑھ، حیدرآباد، لکھنؤ اور حصار کا ویزا حاصل کیا اور ۱۴ فروری ۱۹۵۶ء کو حصار پہنچ گیا۔

تقسیم ہند کے بعد بھارت کا یہ میرا سفر تھا۔ حصار میں پروفیسر سریندر نے ساغر کا ذکر چھیڑا تو میرا دھیان لاہور کی طرف چلا گیا اور ۲ مارچ کو حصار سے دہلی پہنچا تو ماحول کے ایڈیٹر ظفر دہلوی کے ساتھ چاندنی چوک کی سیر کر رہا تھا کہ میٹھا محل کے ایک نچلے درجہ کے شراب خانے کے باہر نریش کمار شاد کو دیکھ کر دل تڑپ اٹھا۔ نریش کمار شاد اگرچہ نشے میں دھت تھا لیکن اس نے مجھے فوراً ہی پہچان لیا مجھے بے تحاشہ سینے سے لگا کر بولا۔

یارا ساغر کو بھی ساتھ لے کر آنا تھا وہ بھی میرا حال دیکھ لیتا۔

نریش کمار شاد اور ساغر ایک دوسرے کے جاننے والے تھے

اور میں نے اسے بتایا کہ ساغر تو ٹوٹ رہا ہے اور میں کچھ نہیں جانتا کہ وہ ٹوٹ چکا ہے یا ابھی کچھ سلامت ہے۔

نریش کمار شاد آبدیدہ ہو گیا اور ہمیں چھوڑ کر دوبارہ شراب خانے میں ... ہو گیا۔ نریش کمار شاد بھی مدہوشی کے غاروں میں اتر چکا تھا۔ ظفر دہلوی نے بتایا کہ حکومت نے نریش کی سرکار وظیفہ مقرر کیا ہوا ہے اور ایک کوارٹر بھی الاٹ کیا ہوا ہے لیکن نہ یہ وقت پر وظیفہ وصول کرنے جاتا ہے اور نہ کبھی کوارٹر میں سوتا ہے
نریش کمار شاد بھی شاعر تھا اور ساغر سے اس کی دوستی امرتسر کے ... سے تھی جہاں وہ ضلع نکودر سے امرتسر میں مشاعرے پڑھنے آتا تھا۔ ... چوک سے گذرتے ہوئے اور شام کو لاہور جانے والی ٹرین میں سوار ہوتے وقت کبھی ساغر نظروں کے سامنے آجاتا اور کبھی نریش کمار لیکن نریش کا... شاد ساغر سے اس لحاظ سے بہتر تھا کہ اسے بھارتی حکومت نے وظیفہ اور کوارٹر دیا ہوا تھا اور ساغر لاہور پر سایہ کیے ہوئے آسمان کے نیچے غیر مح... تھا۔

مارچ کے پہلے ہفتے میں لاہور کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی میں نے انارکلی، سرکلر روڈ، موری دروازہ، بھاٹی دروازہ، ٹکسالی دروازہ، پیسہ اخبار اور شاہ عالمی میں تمام ٹھکانوں پر ساغر کو تلاش کیا لیکن اکرام نے ہر بار یہ کوشش ناکام بنا دی اور مجھے ہر روز قائل کرنا شروع کر دیا کہ ہمیں سب سے پہلے رو... حاصل کرنا چاہیئے اور اس کے بعد اپنے شاعرانہ خیالات کی طرف دھیان دینا چاہیئے اکرام کا خیال تھا کہ ہمارے پاس روپیہ ہو گا تو ہم بہت دانشور بن سکتے ہیں۔

میں روزانہ اندرون شہر سے چل کر اکرام کے پاس آجاتا اور ہم دونوں روپیہ کمانے کے طریقے سوچنے لگتے۔ اس دوران مجید ناصر نامی کراچی کے ایک شخص نے ہم دونوں کو مشورہ دیا کہ ہم نوجوان پارٹی کے نام سے ایک اصلاحی انجمن بنائیں۔ اور اس انجمن کے ذریعے لاکھوں روپے کمائے جا سکتے ہیں۔

اکرام لدھیانوی اس سکیم میں پیش پیش تھا اور ہم نے چند دنوں میں نوجوان پارٹی قائم کر لی۔ اور سردار عبدالرشید موگل مرحوم کے پاس گئے جس کو مجید ناصر اور اکرام نے پارٹی کا سرپرست بننے پر مجبور کر دیا اور سردار عبدالرشید جو ایک جاگیردار تھا ہمارے پروگرام سے متاثر ہو کر اس نے ہماری مالی امداد کرنا شروع کر دی۔ اور ہم نے شاہ عالمی میں نوجوان پارٹی کا دفتر کھول لیا۔

مجید ناصر پہلی امدادی رقم سے اپنا حصہ لے کر کراچی چلا گیا اکرام نے اپنا حصہ لے کر دفتر میں قدم رکھنا بند کر دیا اور اس وقت آتا جب مہینہ ختم ہو رہا ہوتا اور سردار عبدالرشید سے قسط وصول کرنے کی تاریخ آنے والی ہوتی۔ جب قسط مل جاتی تو اکرام لمبے چوڑے پروگرام بناتا۔ اس کا خیال تھا کہ ہم بہت جلد سیاست میں اپنا کردار ادا کرنے لگیں گے اور ایک روز پاکستان کا اقتدار اپنے ہاتھوں میں ہو گا۔

میری ماں ان دنوں سخت بیمار تھی اور سردار عبدالرشید سے چھٹی قسط اکرام لدھیانوی نے خود ہی وصول کر لی تھی اور وہ ایک خیالی لڑکی کا انتظار کرنے کے لیے سارا سارا دن لارڈز ہوٹل میں بیٹھا رہتا۔ دفتر کا کرایہ بڑھتا جا رہا تھا اور میں سارا سارا دن ساتھ والے دفتر کے مالک سیف اللہ کے پاس بیٹھا رہتا جس نے بچت پرائز اسکیم کا کاروبار شروع کیا ہوا تھا اور براؤن آنکھوں والی

ثریا قریشی اس کی مینیجر تھی۔ ثریا قریشی اندرونِ شہر سے برقعہ اوڑھ کر دفتر میں آتی تھی اور پکچر پرائز اسکیم کے فیل ہونے کے بعد سیف اللہ نے اپنے دفتر میں فلاش کھیلنے والوں کو بلانا شروع کر دیا تھا

ثریا قریشی کو بھی افسانے اور شعر لکھنے کا شوق تھا اور ایک روز اس نے بتایا کہ اس نے ساغر صدیقی کو چوک ستھاں میں دیکھا ہے اور وہ بھکاریوں کی طرح چوک میں گرا ... میرے لیے ساغر کو ان حالات میں ہجوم سے نکل کر تلاش کرنا ناممکن تھا۔

اور مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں نوجوان پارٹی کے اندر ہی دفن ہو جاؤں گا۔ جب بلڈنگ کے منشی نے کرائے کے لیے تنگ کرنا شروع کر دیا اور ساتھ ہی یہ شرط بھی لگا دی کہ اگر دفتر خالی کر دیا جائے تو کرایہ معاف ہو سکتا ہے۔ ثریا قریشی سارے حالات سے واقف تھی اور میں نے اس کے مشورے سے اکرام کو تلاش کیا اور اسے صورتحال بتائی تو اس نے کہا فکر نہ کرو۔ وہ وقت قریب آ رہا ہے جب ہم یہ بلڈنگ خرید لیں گے تم واپس جاؤ اور میرا انتظار کرو میں اپنی دوست لڑکی کو مل کر دفتر آ رہا ہوں۔

اگر ثریا قریشی اس ماحول میں نہ ہوتی تو شاید میں سب کچھ چھوڑ کر چلا جاتا۔ اس کی دوستانہ مروتیں بڑی جاندار تھیں اور جب تک پکچر پرائز اسکیم کا دفتر قائم رہا میں نوجوان پارٹی کے دفتر میں صبح ہی صبح آ جاتا اور شام کو ثریا قریشی کے ساتھ ہی دفتر سے نکلتا۔

اکرام لدھیانوی ہوٹلوں میں اس خیالی لڑکی کا بدستور انتظار کرتا رہا اور میں نے کام بند کر دیا۔ ... کی مدد سے دفتر کے فرنیچر کے کرائے سے نجات ... اور دفتر چھوڑ کر ریڈنگ روم میں دوبارہ آنے لگا۔

نوجوان پلپٹ اور ثریا قریشی کے مناظر ختم ہو گئے تھے اور میں نے حنیف قندھاری کے ساتھ مل کر لیل و نہار میں تصویری فیچر لکھنے شروع کر دیئے تھے۔ یہ سلسلہ بڑا حوصلہ افزا ثابت ہوا اور میں سارا سارا دن حنیف قندھاری کے ساتھ ہفتہ وار فیچر لکھنے کے لیے گھومتا رہا۔

حنیف قندھاری لیل و نہار کا اسٹاف فوٹو گرافر تھا اور سبط صاحب اس کے ایڈیٹر تھے۔ ہم ایک روز لنڈا بازار میں سردیاں شروع ہوتے ہی لنڈا بازار پر فیچر کے لیے تصویریں بنا رہے تھے کہ افیون کے ٹھیکے کے ساتھ والی گلی میں سے ساغر صدیقی نمودار ہوا۔

ہم اسے دیکھ کر یکدم حیران ہو گئے۔ حنیف نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا اور پیل پتی کے تمباکو والے پان کی پیک تھوک کر بولا۔

حضرت جی آپ کہاں غائب ہو گئے تھے۔؟

ساغر نے سوال کا جواب دینے کے بجائے صرف اتنا کہا "فقیر کو ایک چونی کی ضرورت ہے۔

حنیف نے پانچ کا نوٹ دے کر کہا۔ یہ لیں اور ہمارے ساتھ چلیں۔ کہیں چائے پیتے ہیں۔

ساغر نے ایک طرف رخ کر کے کہا "پھر سہی۔ ابھی بہت منزل باقی ہے"

ساغر بوسیدہ چادر میں لپٹا ہوا دوبارہ اسی گلی میں داخل ہو گیا اور اپنے پیچھے کئی سوال چھوڑ گیا۔

حنیف قندھاری اور مجھے کم سے کم اتنا اطمینان تو ضرور ہوا کہ اس کے جسم کے ناسور ابھی ٹھیک ہو گئے تھے اور وہ قدرے ہوش میں تھا۔ لیل و نہار سے

وابستگی بڑی سرور انگیز تھی اور اس میں شائع ہونے والے میرے فیچروں، افسانوں اور مضمونوں سے میرے اعتماد میں بھرپور اضافہ ہوا اور میں نے امروز میں فیچر لکھنے شروع کر دیئے۔

۱۹۵۷ء بھی اسی مصروفیات میں گذر گیا اور جب حفیظ قندھاری نے لیل و نہار کی ملازمت چھوڑ دی تو ہم ریڈنگ روم کے باغ میں ایک فیچر ایجنسی قائم کرنے کا خواب دیکھ رہے تھے کہ ۱۹۵۸ء شروع ہو گیا اور حالات نے مجھے تار گھر کے سامنے ایک برطانوی فرم میں آغا ایس پی خاں کی مدد سے دوبارہ کلرکی اختیار کرنے پر مجبور کر دیا جہاں حفیظ قندھاری تقریباً روزانہ مجھے ملنے آتا اور دفتر کے بعد میں اس کے ساتھ رات گئے تک شہر میں گھومتا۔ اسی دوران مجھے کچھ پرانے جاننے والے بھی ملنے لگے اور ان کے ساتھ زیادہ وقت اداکارہ زمرد کے گھر گذرنے لگا۔ کبھی کبھی حفیظ قندھاری بھی وہاں آ جاتا۔ ان دنوں زمرد کی خالہ ادا بہت چھوٹی تھی اور مجھ سے کہانیاں سنا کرتی تھی۔ ایک شام میں اور حفیظ قندھاری شاہی قلعے کی سیڑھیوں کے سامنے گذر رہے تھے کہ شبیر بجلی والا فورٹ روڈ سے آتا ہوا دکھائی دیا۔ اس نے بتایا ساغر بڑی اونچی منزلوں پر ہے اور ایسے راز بیان کر رہا ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا۔ ملنا ہے تو میرے ساتھ آیئے وہ رحم سائیں کے تکیے میں ہے۔ شبیر بجلی والے نے کھانے پینے کا سامان اور کپڑے پکڑے ہوئے تھے۔ وہ بڑے جوش و خروش سے ہمیں رحم سائیں کے تکیے میں لے گیا لیکن اس شام معلوم ہوا کہ ساغر صبح ہی سے غائب ہے اور ایک بابوا سے ملنے کے لیے کئی بار چکر لگا رہا ہے۔ شبیر بجلی والے نے کہا۔

کوئی بات نہیں میں ان کا انتظار کر دوں گا۔ آپ جانا چاہیں تو شوق سے جائیں میں انہیں بتا دوں گا کہ جناب حفیظ قندھاری اور جناب یونس ادیب ملنے کے لیے آئے تھے۔

میں نے برطانوی فرم کے ایک سیلز آفیسر مسٹر گوائن کے ساتھ ایک فلمی ہفت روزہ شائع کرنے کا منصوبہ بنانا شروع کر دیا اور فلمی ستارہ کے نام سے ایک ڈیکلریشن بھی مل گیا تو ساغر کو رحم سائیں کے تکیے میں جا کر ملنے کے بارے میں سارے امکانات ختم ہو گئے۔

میکلوڈ روڈ کے ایک تہہ خانے میں جہاں حسن لطیف نے میوزک اکیڈیمی قائم کی ہوئی تھی مسٹر گوائن اور آغا بشیر کی مدد سے فلمی ستارہ کا دفتر کھل گیا تو اسی دوران ایوب خان نے ملک میں مارشل لا لگا کر قبضہ کر لیا۔

فلمی ستارہ کے دو تین شمارے ہی شائع ہوئے تھے کہ خالد محمود ناراض ہو گیا اور یہ دفتر بھی بند ہو گیا۔ لیکن میں فلمی ستارہ کے اجراء پہ اتنا پُر اعتماد تھا کہ میں نے برطانوی فرم سے استعفیٰ تک دے دیا تھا اور فلمی ستارہ کے بند ہونے سے جب حفیظ قندھاری مسٹر گوائن کے پیسوں سے خریدا ہوا فوٹوگرافک [illegible] اٹھا کر راولپنڈی چلا گیا تو مجھے زندگی میں زبردست دھچکا سا لگا اور میں نے وقت گزارنے کے لیے دوبارہ ریڈنگ روم میں پناہ لے لی۔

ریڈنگ روم کی طرف آنے والے تمام راستوں پر حالات کی دھند پھیلی ہوئی تھی اور انہی راستوں پر سے گذرتے ہوئے ساغر کے بارے میں مختلف قسم کی خبریں ملتیں۔ ریڈنگ روم میں اکرام لدھیانوی اور قمر تسکین نے بھی آنا شروع کر دیا تھا اور اعجاز رضوی بھی عارف امان کے ساتھ کبھی کبھی اس طرف کا چکر لگا لیتا تھا۔

اب اپنی حقیقت بھی ساغرؔ بے ربط کہانی لگتی ہے
دُنیا کی حقیقت کیا کہیے کچھ یاد رہی کچھ بھول گئے

علم و ادب آرٹ اور فن کے نام پر غلط بخشیاں تو پہلے سے ہو رہی تھیں اور حکمران طبقوں کے فلسفہ کے ترجمان اہلِ قلم بڑے فائدے میں تھے۔ اہلِ علم و قلم اپنے استحقاق کا کاسہ لے کر حکمران طبقوں کے سامنے سرنگوں تھے، لیکن اس شہر میں صرف ساغر ایک ایسا وجود تھا جو جبہ و دستار کی عنایات سے بے نیاز تھا اور اپنے فکر و شعور کی راہوں پر عاشقوں کی طرح رواں دواں تھا۔ امریکی امداد کے ذریعے علم و ادب میں حکمرانوں کے فلسفہ کی جو لہر آئی تھی اس نے شعر و ادب میں ایسے لوگ پیدا کر دیئے تھے جو اپنی سماجی حیثیت کی تعمیر کے لیے سچائیوں سے انحراف کے مرتکب ہو رہے تھے۔

علمی محفلوں اور سرکاری سرپرستی میں ہونے والے مشاعروں سے ساغر خود ہی الگ ہو گیا تھا اور اس کی معاشی زندگی کا سارا انحصار اپنے شعری تجربوں کی غزباً فروخت کے عمل پر تھا۔ کچھ لوگ اس سے غزلیں خریدنے لگے تھے۔ وہ اسے ہنکور روڈ، انارکلی کے ہوٹلوں میں لے جاتے۔ اسے چائے سگریٹ پلاتے اور شرمناک معاوضہ دے کر غزلیں اور نظمیں لکھوا کر لے جاتے۔

• وہ خود بھی کسی نہ کسی رسالے یا اخبار کے دفتر میں چلا جاتا جہاں سے اسے اپنی

شعری تخلیقات پر نہ صرف حقیر سا معاوضہ مل جاتا بلکہ اس کا کلام باقاعدگی سے لوگوں کے سامنے آنے لگا تھا۔ اس کے منفرد شعری اسلوب اور زندگی کے بارے میں اُس کے صداقت پرستانہ افکار و احساس کے حوالے سے لوگ اسے چاہنے لگے تھے۔ میکانکی شاعروں کی صف میں اُسے سب سے زیادہ نمایاں کرنے والا عنصر درد کا وہ شعور تھا جسے اس نے زندگی سے براہِ راست حاصل کیا تھا اور اسے اپنی گذشتہ گمشدگی کے تجربات کے بعد اپنے حواس کے ذریعہ حیات و کائنات کا جس انداز سے ادراک ہوا تھا وہ کوئی بے عمل خیال پرستی نہ تھی۔ اب دُور دُور سے لوگ اسے تلاش کرنے لاہور آنے لگے تھے۔

اسے ملتان، سیالکوٹ، بہاولپور، جہلم، راولپنڈی اور آزاد کشمیر سے مشاعروں کی دعوتیں ملتیں وہ انکار کر دیتا تو کچھ لوگ زبردستی اسے اپنے ساتھ لے جاتے۔ کئی کئی دن اپنے پاس رکھتے اور جب وہ لاہور آتا تو ان گنت منصوبے اس کے ذہن میں ہوتے لیکن پیسے خرچ ہوتے ہی یہ منصوبے اس کے ذہن کے سرد خانے میں چلے جاتے اور وہ لاہور شہر کی سڑکوں پر ننگے پاؤں چلتا نظر آتا تو لوگ اس کی تباہ حالی پر تبصرے کرتے ہوئے پاس سے گزر جاتے۔

انہی دنوں میرا پہلا ناول گندی گلی شائع ہوا۔ نوائے وقت میں اس پر حبیب اللہ اوج صاحب کا لکھا ہوا — تبصرہ پڑھ کر ساغر نے گھنٹوں اس ناول کے بارے میں باتیں کیں اور میں پہلی بار یہ جان کر حیران ہوا کہ وہ ناول نگاری اور کہانی نویسی کا بھی بڑا گہرا شعور رکھتا تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ بھی ایک فلمی کہانی لکھنا چاہتا ہے۔ میں سمجھا کہ شاید ساجد انبالوی کے مکان کی سیڑھیوں میں رہنے سے ساغر پر ساجد کا جادو چل گیا ہے لیکن ایسی کوئی بات نہ تھی وہ اپنے نظم کرنے والی کو کہانی میں ڈھالنے کے بارے میں بڑا بے تاب تھا۔ وہ فلمی صنعت میں رہ چکا تھا۔ اور اسے اپنے فلمی اخبار کا ڈیکلریشن بھی بہت یاد آتا تھا جسے اس نے مولوی کو تر

نیازی کے خیر خواہ   غلام جیلانی نیازی کے ہاتھ ۵ روپے میں بیچ دیا تھا۔
میں گندی گلی نکلنے کے بعد ہفت روزہ لیل و نہار سے وابستہ ہو چکا تھا لیکن ایوب خان نے پروگریسو پیپرز لمیٹڈ کے امروز، پاکستان ٹائمز اور لیل و نہار کو سرکاری تحویل میں لے لیا تھا۔ اب لیل و نہار میں وہ پہلی جیسی دلچسپی نہ رہی تھی اور میں پہلے کی طرح بیکار تھا اور میرا زیادہ وقت ساغر صدیقی کے ساتھ گذرتا تھا۔

اس گذر اوقات میں فوٹو گرافر حفیظ قندھاری بھی شامل تھا جو اپنے نحیف و نزار کندھوں پر کیمرہ لٹکا کر آجاتا۔ کبھی قیصر سرائے اور کبھی اخبار مارکیٹ کے سامنے نوبہار ٹی سٹال میں ہم اکٹھے ہو جاتے کیونکہ شبیر بجلی والے نے آخر بجلی سے حفظی تربیت کا سکول کھولنے میں کامیابی حاصل کر لی تھی اور شیخوپورہ روڈ جس کی ایک بستی کے ویران علاقے میں سکول کی تعمیر شروع ہوتے ہی شبیر ساغر کے ہاتھوں رسم افتتاح کروانے کے لیے اسے اپنے ساتھ لے گیا تھا جس کے بارے میں شبیر نے ایک مثالی خواب دیکھا ہوا تھا۔ "یہ سکول ایک مثالی ادارہ بن جائے گا۔ وہ نوجوانوں کو اخوت اور مساوات کا پیکر بنانے میں کامیاب ہوں گے اور سکول میں مساوات محمدی ہو گی۔ ہم سب وہاں بھائیوں کی طرح رہیں گے۔ ایک جیسا کھائیں گے۔ ایک جیسا پہنیں گے۔"

ریڈنگ روم میں ملنے والا نثار بھی سکول کی تعمیر میں مصروف ہو گیا تھا اس نے بھی کئی بار مجھے وہاں جانے کی ترغیب دی لیکن جس روز میں بس میں سوار ہونے کے بعد نوہاری دروازے کے باہر کھڑا تھا۔ ساغر آتا ہوا دکھائی دیا اور وہ مجھے ساجدا بناوری کے مکان کی سیڑھیوں والی رہائش گاہ کی طرف لے جانے کی بجائے قیصر سرائے میں لے آیا۔ عید آنے والی تھی!

ساغر نے رمضان سے پہلے ہی یہ پروگرام بنا لیا تھا کہ عید کے روز قیصر سرائے میں جشن منائیں گے، فرشتوں کا کھانا پکائیں گے اور یوں روٹھی ہوئی عید

منائیں گے۔ عید سے تین روز جب شہر میں خرید و فروخت عروج پر تھی۔ ساغر ان خریدی جانے والی خوشبوؤں کے ہجوم میں اکدم گھبرا گیا اور کسی نے بتایا۔ اس نے لنڈے بازار میں کہیں قیام کر لیا ہے اور رام گلی کی طرف جاتا ہوا نظر آتا ہے۔ عید کے دن میں اور حفیظ قندھاری صبح نوہاری میں مل گئے، کیمرہ حفیظ کے گلے میں تھا اور ہم یونہی قیصر سرائے کی طرف چلے تو یقین نہیں تھا کہ ساغر وہاں مل جائے گا۔ لیکن یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ ساغر اپنی مخصوص کوٹھڑی کے باہر ٹوٹی ہوئی چارپائی پر بیٹھا اپنی پوروں سے جوئیں چن رہا ہے۔

اس نے ہمیں برآمدوں میں سے دیکھا تو حسب عادت اٹھ کر بولا کمال ہی ہو گیا ہے۔ مجھے تو یاد ہی نہیں تھا کہ آج عید ہے۔ لنڈے بازار میں میری آنکھ کھلی اور دھلے دھلائے لوگوں کو دیکھا تو سمجھ گیا کہ واقعی آج عید ہے اور میں سیدھا یہاں آگیا۔ تم سناؤ، واہ واہ یہ تو بہت ہی اچھا ہو گیا ہے کہ آپ لوگ آگئے ہیں۔ میں نے رات عید کے چاند پر نظم بھی لکھی ہے۔"

ہم ٹوٹی ہوئی چارپائی پر بیٹھ گئے چارپائی پر آلات مدہوشی پڑے تھے ساغر نے ان کو سمیٹا اور اپنی جوگیوں والی زنبیل میں رکھ کر چائے لانے کے لئے جانے لگا تو میں نے کہا۔ "ٹھہرو ساغر میں چائے کے لیے کہہ آتا ہوں۔"

ساغر نے سر ادھر ادھر ہلا کر کہا۔ "نہ بابا! تم فقیر کے ڈیرے پر آئے ہو، اتنا تو اخلاق برتنے دو۔" چائے آئی تو میدان سے اٹھ کر دو شخص اور آئے۔ ساغر نے ہمیں کہا۔ "تم بھی بیٹھو اور چائے پیو۔" پھر ہمیں مخاطب کر کے بولا۔ "یہ دیکھ [illegible] سے دور ہیں۔ میرا تو دل چاہتا تھا سویاں تیار کریں پر کون اس الجھن میں پڑے۔"

دونوں پردیسی اسے حیرت سے تک رہے تھے۔ جو مہربان ماؤں کی طرح پیالیوں میں چائے ڈال کر انہیں دے رہا تھا۔ میں ساغر سے اس کی تازہ نظم سننا چاہتا تھا لیکن ساغر نے خود ہی زنبیل سے ایک کاغذ نکالا اور پائینتی کی طرف بیٹھ کر نظم سنانے لگا۔ وہ تحت اللفظ میں نظم پڑھ رہا تھا۔ اس کا لہجہ میرے احساس میں روشن ہو گیا ہے اور مجھے اس کی آواز سنائی دے رہی

عید کا چاند ہے خوشیوں کا سوالی اے دوست
خوشیاں بھیک میں مانگے سے کہاں ملتی ہیں!
دستِ سائل میں اگر کاسۂ غم ہی چیخ اُٹھے
تب کہیں جا کے ستاروں سے گراں ملتی ہیں

عید کے چاند مجھے محرمِ عشرت نہ بنا
میری صُورت کو تماشائے الم رہنے دے
مجھ پہ حیراں ہیں اگر اہلِ کرم ہونے دو
دہر میں مجھ کو شناسائے الم رہنے دے

یہ مسرت کی فضائیں تو چلی جاتی ہیں
کل وہی رنج کے آلام کے دھارے ہوں گے
چند لمحوں کے لیے آج گلے مل کے جا
اتنے دن تو نے بھی ظلمت میں گزارے ہوں گے

قیصر سرائے میں ساغر کے ساتھ یہ میری عجیب سی عید تھی۔ سرائے کے مسافر اپنے اپنے شہروں میں جا چکے تھے اِکا دُکا مسافر جو رہ گئے تھے شہر میں چلے گئے تھے اور فضا میں بڑی بوجھل خاموشی تھی۔ ساغر سے باتیں کرتے کر

شام ہو گئی اور برآمدوں میں اندھیرے پھیل گئے تو ساغر کے اندر سے بے چینیوں کا لاوا پھوٹ پڑا۔ اس نے اپنی بے رنگ کیفیتوں کی چادر سے نکلنے کی ہر بار کوشش کی اور کمبل اٹھا کر جانے لگا تو حفیظ نے پوچھا۔ کہاں حضرت صاحب۔؟
"بس ذرا یونہی بکھرنے کو دل چاہ رہا ہے۔ پھر سبھی خیال ڈسنے لگے ہیں۔ فقیر بے حال ہونے سے بچنا چاہتا ہے۔"

ساغر کے ساتھ ہی میں اور حفیظ قندھاری سرائے سے باہر نکلے تو بڑی سرد ہوا چلنے لگی تھی اور ساغر آہستہ آہستہ رام گلی کی طرف جا رہا تھا۔

قیصر سرائے نیا بازار کے سامنے بسوں کے اڈے کے اندر واقع تھی جس میں کیمپ جیل کی کوٹھڑیوں جیسے کمروں کی قطاریں تھیں۔ درمیان میں ایک کھلا میدان تین غسل خانے اور مسجد بنی ہوئی تھی۔ قیصر سرائے میں ہر کمرے کا کرایہ پانچ روپے روزانہ تھا۔

ساغر نے جنوبی قطار کے آخری کمرے میں ڈیرہ لگا لیا تھا۔ اب حفیظ قندھاری اور میں اسے تلاش کرنے سب سے پہلے قیصر سرائے میں آتے اگر وہ یہاں نہ ملتا تو ہم لوہاری کے باغ کی درمیانی سڑک سے بھاٹی تک جاتے۔ پھر داتا دربار کے عقب میں غار کے زمانے کا منظر پیش کرنے والی کوٹھڑیوں پر مشتمل ایک کٹڑی میں جا نکلتے، جہاں افغانستان کے باشندے رہتے تھے۔ عورتیں بھیک مانگنے نکل جاتی تھیں اور مرد روڑی کوٹنے کی ہتھوڑیاں پکڑ کر شہر کا رخ کر لیتے تھے۔ یہاں لالہ جوگی رہتا تھا اور ساغر دن میں ایک مرتبہ لالہ جوگی کے پاس ضرور آتا تھا۔ گندگی، بدبودار اور سڑاند سے بھری ہوئی کٹڑی کے لالہ جوگی سے ساغر کا نہ جانے کیا رشتہ تھا کہ جتنا وہ جاری   لالہ جوگی اُٹھ کر ساغر کے قدم چھوتا اسے اپنی ریچھ کی کھال کی مسند پر بٹھاتا۔ افغانی پیالیوں میں چائے پیش کرتا اور ساغر کے ساتھ جڑی بوٹیوں کی تاثیر پر باتیں کرنے لگتا۔

ایک مرتبہ ہم لالہ جوگی کی کوٹھڑی میں داخل ہوئے تو لالہ جوگی اور ساغر با
کر رہے تھے ۔ مجھے اور حفیظ قندھاری کو دیکھ کر دونوں نے گفتگو بند کر
______ اور لالہ جوگی نے ساغر کو اپنے ہندو
کی باتیں سنانا شروع کر دیں لیکن ساغر ہمیں وہاں سے لے کر کمرہ کھڑکی
میں آ گیا جہاں اس نے خادم حسین کی محبتوں کے بڑے گہرے مناظر دیکھے
اور خود بھی اس نے کھڑکھڑی پیر کے احاطے میں ذہنی گمشدگی کا طویل عرصہ
گزارا تھا . . . . . ساغر کے ساتھ ہم سارا سارا دن باغوں ، ویران گذرگاہوں
پرانی خانقاہوں اور تباہ حال لوگوں کے ہجوموں میں گزارتے اور شام ہونے
سے پہلے پہلے قیصر سرائے تک اُسے الوداع کہتے اور رخصت ہو جاتے۔ حفیظ
قندھاری کو بھی اندر ہی اندر جلنے والے چہروں اور تباہ حال جگہوں کی تصویر
اتارنے کا جنون تھا۔

زندگی کا جو رُخ سامنے تھا اُس کو دیکھتے ہوئے جب قیصر سرائے میں باتیں
ہوتیں تو ساغر قدیم زمانوں کے پیغمبروں کی طرح گداز سے پگھل جاتا۔ اور اُٹھ
سائے کی طرح ٹہلنے لگتا۔ اس کے ہونٹ ہلنے لگتے اور اُس کی ڈوبی ہوئی آو
سنائی دینے لگتی۔ بے ربط فقرے، اجنبی لفظ اور بے چہرہ علامتیں۔

حفیظ قندھاری بھی بیکار تھا۔ وہ سال میں کئی کئی بار بیکاری کا شکار رہتا
اور راولپنڈی میں فاقے کرنے والے بچوں کو یاد کر کے بہت اداس ہو جا
کبھی کبھی حفیظ قندھاری گوالمنڈی میں خواجہ صادق کاشمیری کے گھر میں جانے
بجائے قیصر سرائے میں ساغر کا مہمان بن جاتا تھا تو ساغر سردیوں کی راتوں میں
ہی میلے کچیلے لحاف کو حفیظ قندھاری پر ڈال کر خود باہر نکل جاتا۔ رات کسی
میں گزارتا اور حفیظ قندھاری کے بیدار ہونے سے پہلے پہلے سرائے میں

سردیوں میں قیصر سرائے ساغر کا مستقل ٹھکانہ بن گئی تھی۔ اور اس کی یہ غزل جس
کا یہ شعر بہت مقبول ہے۔

جس عہد میں لُٹ جائے فقیروں کی کمائی
اُس عہد کے سلطان سے کوئی بھول ہوئی ہے

غالباً اُسی وقت میں شائع ہوئی تھی اور قیصر سرائے میں ہی اُس نے
کہی تھی۔ لیکن جونہی میرے ساتھ اکرم لدھیانوی
قیصر سرائے میں آنے لگا تو سردیاں بیت رہی تھیں اور ایک دوپہر ہم دونوں سرائے
میں داخل ہو رہے تھے تو گیٹ میں میز پر رجسٹر کھول کر بیٹھنے والے منیجر نے بتایا
ساغر صاحب کمرہ خالی کر گئے ہیں۔

ساغر پھر فیڈ آؤٹ ہو گیا تھا اور میں نے کالم کی بنیاد پر لیل و نہار میں فیچر
لکھنے شروع کر دیئے تھے لوہاری کی طرف گھر جاتے ہوئے میری نگاہیں
آس پاس ساغر کو ضرور تلاش کرتیں لیکن وہ کہیں بھی نظر نہ آتا۔ میں پان گلی سے
گزر کر پاک لینڈ پریس میں جا نکلتا۔ گیلانی پریس میں حلیم شاہ سے پوچھتا۔ ساغر
کہیں نظر آیا ہے؟

حلیم شاہ حقہ کا کش لے کر جواب دیتا" ساغر صاحب کہاں ہوں گے؟ یہ
تو وہ خود جانتے ہیں لیکن اس طرف نہیں آئے ہاں۔ اگر کہیں مل جائیں تو انہیں
کہیں کہ اورینٹل کالج کے دو طالب علم ان کو تلاش کر رہے تھے"۔

ساغر کے ٹھکانے کا علم کسی کو بھی نہیں تھا لیکن لاہوری سے شاہ عالمی تک کچھ
لوگوں نے بتایا کہ وہ صبح کو سواری والے تانگے میں سے گذرتا ہے۔ کہاں جاتا ہے؟
کچھ پتہ نہیں۔

میں دوبارہ لیل و نہار کے ساتھ ساتھ امروز میں بھی ہفتہ وار فیچر لکھنے میں مصروف ہوگیا تھا۔ لیکن ساغر سے ملنے کی آرزو ہمیشہ بے تاب رکھتی تھی۔ سارا دن لیل و نہار کے دفتر میں فیروز نظامی اور نصیر انور، نواز اور حسن عابدی کے ساتھ گذر جاتا اور شام کو انارکلی میں اکرام لدھیانوی سے ملاقاتیں جاری تھیں۔

اس کے والد صوفی برق کا جالندھر موتی چور کے اوپر آستانہ تھا جہاں میں کبھی کبھی دن کے وقت بھی آتا تھا اور تصوف کے اسرار و رموز میں میری دلچسپی اس حد تک بڑھی کہ میں فارغ ہو کر صوفی برق کے آستانے پر رہنے لگا۔ جہاں رفتہ رفتہ ساجد انبالوی، راحین، اعجاز رضوی اور کئی دوست وہاں آنے لگے تھے۔ راحین ڈھاکہ سے واپسی پر بحرین جانے کا پروگرام بنا رہا تھا۔ برق صاحب کے آستانے سے جانے کے بعد وہاں ہمارا قبضہ ہو جاتا تھا۔ ساغر نے بھی یہاں کئی سال گذارے تھے۔ اس حوالے سے وہ اکثر یاد آجاتا اور پھر ساجد انبالوی کو اکرام نے اس بات پر آمادہ کر لیا تھا کہ وہ یہ مشہور کر دے کہ جن دنوں ساغر اس کی بلڈنگ کی سیڑھیوں میں رہتا تھا۔ اس کا ذاتی دیوان چرا کر لے گیا تھا۔

واقعی ساجد انبالوی اس بات پر پکا ہو گیا اور یہ بات ساغر صدیقی کے مداح قدیر رشیدائی تک جا پہنچی جس نے گوالمنڈی سے گذرتے ہوئے ساغر کو یہ خبر سنا دی کہ اکرام کے ڈیرے پر شام کو ساجد انبالوی آتا ہے اور لوگوں سے کہہ رہا ہے کہ ساغر اس کا دیوان چرا کر لے گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر قدیر رشیدائی ساغر کو یہ خبر نہ سناتا تو ممکن ہے، ساغر کبھی نہ کبھی دوبارہ انارکلی میں واپس آجاتا۔ اس نے طویل عرصہ تک اس طرف کا رخ ہی نہ کیا اور داتا گلی سے لنڈا بازار تک اور پھر اعظم مارکیٹ تک جانے والی راہ میں گم ہو گیا۔ جب یہ بات بڑھی تو میں نے اکرام لدھیانوی کو سختی سے منع کیا کہ وہ ساجد انبالوی کو یہ بہتان تراشی کرنے سے روک دے ورنہ میں اس کا منہ بند کر دوں گا۔ اور تم بھی دوسروں کو اذیت دینے کی عادت ترک کر دو۔

اکرام لدھیانوی پر اس کا اثر ہوا یا نہ ہوا لیکن ساجد انبالوی نے توبہ کر لی۔ ساغر پر یہ حادثہ اتنا گراں گزرا کہ اس نے لوہاری سے دامن ہی چھڑا لیا مدتوں تک اس کا چہرہ نظر نہ آیا۔ اگرچہ ہزاروں لاکھوں چہرے روزانہ آنکھوں کے سامنے سے گذرتے تھے لیکن نہ جانے اس کی صورت میں کونسی کشش تھی کہ بھولتی ہی نہ تھی۔ حفیظ قندھاری نے فیچر سرائے میں ساغر کی کچھ تصویریں اتاری تھیں، جن کے نیگیٹو میرے پاس تھے۔ میں نے اس کے پازیٹو بنوائے اور ایک فیچر لکھ کر نصیر انور کے سامنے رکھ دیا۔ نصیر انور نے اس کا نام "اندھیری رات کا سایہ" تجویز کیا اور جب یہ فیچر شائع ہوا تو مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ اس شمارے کے بارے میں جتنے خطوط اس ہفتے دفتر میں موصول ہوئے وہ سارے کے سارے ساغر پر میری اس پہلی تحریر پر تھے۔ اور لڑکیوں کے لکھے ہوئے تھے۔

ویسے بھی ساغر پر میری اس پہلی تحریر کو لوگوں نے بڑا پسند کیا۔ تنویر نقوی اور حسن لطیف ملک، انور جٹالوی اور دوسرے دوستوں نے خاص طور پر اس فیچر کی تعریف کی۔

ابھی تین ہی ہفتے گذرے تھے کہ حفیظ قندھاری انارکلی میں آگیا اور ہم ٹہلتے ٹہلتے پرانی ریڈنگ روم کی طرف جا رہے تھے کہ اچانک گوشۂ ادب کے سامنے ساغر صدیقی نظر آگیا۔ ہم شوق سے آگے بڑھے تو ساغر سخت ناراضگی اور ذہنی دباؤ میں تھا۔ اس نے بڑے احتجاج بھرے لہجہ میں کہا —

تم لوگوں نے فقیر کو رسوا کر دیا ہے۔ حفیظ قندھاری تو جاسوس ہے اور تم بھی اس کے ساتھ شامل ہو گئے۔ تم لوگوں نے فیچر چھاپ کر مجھے تباہ کر دیا ہے

تم دونوں نے فقیر کو فروخت کیا ہے۔"

یاد نہیں ساغر نے کیا کیا کچھ کہا اور بڑبڑاتا ہوا چلا گیا۔ میں اور حفیظ قندھاری شرمسار سے ہو کر رہ گئے اور مجھ پر ساغر کا احتجاج بجلی بن کر گرا۔ ساغر تو فیچر کی اشاعت پر سخت برہم تھا اور مجھے یقین تھا کہ اب وہ مجھے زندگی بھر نہیں ملے گا۔

ہم نے پھولوں کے واسطے ساغر
خار زاروں میں ہاتھ پھیلائے

رام گلی ہی کے حوالے سے جب ایک روز ساغر کی گرفتاری کی خبر ملی تو میں نہ جانے کہاں تھا۔؟ کچھ یاد نہیں، حفیظ قندھاری بچوں کے لئے راولپنڈی گیا ہوا تھا اور شہر میں کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ ساغر کس جرم میں پکڑا گیا ہے۔ میں نے اُسی روز احمد نثار کے گھر پر دستک دی۔ وہ موجود نہیں تھا اور شاہ عالمی سے گذر رہا تھا کہ ہمایوں کاشمیری مل گیا۔ وہ بہت ہی رنجیدہ تھا اور اس نے اپنی چھیتے ہوئے لہجے میں چھوٹتے ہی کہا۔

"ادیب یار! ساغر گرفتار ہو گیا ہے اور میں نے تھانے سے پتا کیا ہے۔"

میں تفصیل جاننا چاہتا تھا لیکن ہمایوں جلدی میں تھا۔ وہ اپنے محلے کے کسی وکیل کے پاس جا رہا تھا اور اس نے دوسرے دن کچہری میں آنے کی تاکید کی۔

ہمایوں گلیوں میں غائب ہو گیا اور میں انار کلی میں آ کر لیڈیز بکس کے پاس کھڑا ہو گیا۔ مجھے بار بار یہ حقیقت اذیت دے رہی تھی کہ اس پر کیا بیت گئی ہو گی اس کے پاس جو سن کی آزادی رہ گئی تھی وہ بھی اس سے چھن گئی تھی۔

لیڈیز بکس کے پاس کھڑے کھڑے جب کافی دیر ہو گئی اور کوئی بھی نہ آیا تو میں انارکلی سے ہوتا ہوا مال کی طرف آ نکلا۔ سارا شہر اپنے اپنے کاموں میں معروف تھا لوگ ایک دوسرے کو دیکھے بغیر گذر رہے تھے اور میں جیل میں سلاخوں کے پیچھے اس قیدی کو دیکھ رہا تھا جس نے اس شہر میں لوگوں کو محبتوں کے نغمے سنائے تھے در و بام کی خیر مانگی تھی اور اس کے سوا کچھ نہیں مانگا تھا۔

وہ رات میں نے بڑے کرب میں گذاری اور دوسرے دن کچہری کا چکر کاٹ کر شاہ عالمی پہنچا تو ہمایوں نے بتایا کہ آج بھی ضمانت نہیں ہو سکی۔ ساغر کو رام گلی مارفیا کے اڈے سے چھاپے کے دوران گرفتار ہوا تھا۔ اُس وقت وہاں فاطمہ نامی ایک عورت بھی تھی اور کچھ دوسرے زندگی کے ستائے ہوئے سوتی کی لذت میں لتھڑے ہوئے تھے کہ پولیس کی بھاری جمعیت اندر داخل ہوئی اور ساغر سمیت سب کو پکڑ کرلے گئی۔ ساغر پہ مارفیا اور اسلحہ رکھنے آوارہ گردی اور ایک عورت کے ساتھ راز و نیاز کی باتیں کرنے کے الزامات ایف آئی آر میں درج کرتے وقت پولیس نے بڑی فرض شناسی کا ثبوت دیا تھا مجھے یقین ہے۔ ساغر نے اپنے بارے میں الزامات سن کر یہی کہا ہو گا: "میں کچھ بھی نہیں ہوں۔ وہی ہوں جو تم سمجھتے ہو۔"

اب ہمایوں کاشمیری ہی ساغر کے مقدمے کی پیروی کر رہا تھا۔ اس نے اعجاز رضوی کے ساتھ مل کر افضال ایڈووکیٹ سے بات کی اور ہمایوں نے جذباتی ہو کر مشورہ دیا کہ ساغر کی ضمانت نہ کروائی جائے بلکہ عدالت سے آگے دماغی امراض کے شفاخانے میں منتقل کر دیا جائے اس طرح وہ خود اختیاری مدہوشی

کے عل سے ہمیشہ کے لیے نجات حاصل کرے گا۔ ساغر صدیقی قیدی سے ہمدردی کے اس اُبال نے افضال ایڈووکیٹ سے ایک درخواست تیار کروائی جس میں ساغر کی طرف سے یہ کہا گیا کہ میں مارفیا کا عادی ہوں۔ اس بُری لعنت سے نجات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ لہٰذا علاج کی خاطر مجھے جیل کی بجائے پاگل خانے بھجوا دیا جائے۔

تیسرے روز باقی ملزموں کے ساتھ ساغر کو پولیس جیل سے لائی تو اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں تھیں۔ ہمایوں کاشمیری اس کی طرف گیا تو خود اس کی آنکھوں میں آنسو تھے، وہ ساغر کے گلے لگ کر خوب رویا۔ اتنا رویا کہ ساغر پریشان ہوگیا۔ اس نے ہمایوں کاشمیری سے التجا کی۔

"کاشمیری بابا! مجھے دوبارہ جیل نہ جانے دیا جائے، میں مر جاؤں گا۔ میرا بدن پھوڑے کی طرح دکھ رہا ہے اور میرا ذہن سنسان ہوگیا ہے"

ساغر کو دیکھ کر وہاں بہت سے لوگ جمع ہوگئے تھے اور ایک دوسرے کو پوچھ رہے تھے۔ یہ کون سیاہ پوش ہے۔ ہمایوں کاشمیری ساغر سے محبت کے جذبات میں بہت آگے نکل گیا تھا، بس اس کے دماغ میں یہی تھا کہ کس طرح ساغر کا علاج ہوجانا چاہیئے۔ افضال ایڈووکیٹ انگریزی میں ٹائپ شدہ درخواست لے کر آیا۔ تو ساغر نے پوچھا یہ کیا ہے؟

ضمانت نامہ ہے اس پر دستخط کردو۔ ہمایوں کاشمیری نے کہا۔

ساغر نے دستخط کرنے کے لیے قلم پکڑا تو ایک بار پھر اس نے ایک ایک کر کے سب کے چہرے پر نظر ڈالی اور بڑبڑا کر دستخط کر دیئے۔ "تو ہی وارث ہے"

افضال ایڈووکیٹ درخواست لے کر ہمایوں کے ساتھ عدالت میں داخل ہوگیا

تھوڑی دیر بعد آواز آئی۔ محمد اختر عرف ساغر صدیقی حاضر ہو۔

گداگروں کی ٹولی کے ساتھ ہتھکڑی میں جکڑا ہوا ساغر لرزاں و ترساں وجود کے ساتھ عدالت میں داخل ہوا تو درخواست مجسٹریٹ کے سامنے پڑی تھی مجسٹریٹ نے اسی لمحے میں درخواست پر دستخط کرتے ہوئے کہا۔

"محمد اختر عرف ساغر صدیقی عدالت تمہاری درخواست منظور کرتی ہے تمہیں جیل کی بجائے مینٹل ہسپتال بھیجنے کا حکم دیتی ہے۔"

ساغر یہ سن کر آبدیدہ ہوگیا۔ اس نے جلدی سے کہا۔" جناب، جناب، فقیر نے تو ضمانت کی درخواست دی ہے۔ آپ فقیر کو پاگل خانے بھجوا رہے ہیں۔"

"یہ درخواست تو تم نے دی ہے" مجسٹریٹ نے درخواست اٹھا کر اسے دکھاتے ہوئے کہا۔

ساغر نے خشمگین لیکن درد میں ڈوبی ہوئی آنکھوں سے دیکھا اور عدالت سے کہنے لگا۔

"حضور میں غریب اور لاوارث شاعر ہوں۔ مجھے پاگل خانے نہ بھجوائیں۔ وہاں میں مر جاؤں گا۔ یہ سارا چکر ہمایوں نے چلایا ہے۔

ہمایوں کون ہے۔؟ مجسٹریٹ نے پوچھا

"جناب میرا نام ہمایوں ہے، ہمایوں نے آگے بڑھ کر کہا۔

تم اسے پاگل خانے کیوں بھجوانا چاہتے ہو ملزم سے تمہاری کیا دشمنی ہے۔

عدالت کے جواب میں ہمایوں نے کہا۔ —

جناب والا! ساغر میرا دوست ہے میرا دشمن نہیں۔ وہ ایک شاعر ہے۔ لیکن بدقسمتی سے مارفیا کا عادی ہے اور میری ناقص رائے میں یہ درست تھا کہ اسے جیل کی بجائے پاگل خانے بھجوا دیا جائے جہاں علاج سے اس کی

عادت دور ہو سکتی ہے۔

"لیکن یہ ساغر کو منظور نہیں، یہ تم نے عدالت کو دھوکا دینے کی کوشش کی ہے اور یہ جرم ہے۔" مجسٹریٹ کے آخری ریمارکس سن کر ہمایوں کے پیروں تلے زمین نکل گئی۔ افضال ایڈووکیٹ نے آگے بڑھ کر عدالت کو یقین دلایا کہ ہمایوں ساغر کا دوست ہے اس کی نیت بُری نہیں اور اگر ساغر اس پر آمادہ نہیں ہیں تو یہ درخواست واپس لینے کی درخواست منظور فرمائی جائے۔

مجسٹریٹ نے درخواست پر اپنے دستخط کینسل کرتے ہوئے ساغر سے کہا میں آپ کی ضمانت لینے پر تیار ہوں آپ انہیں کہیں کہ ضمانت کا بندوبست کریں۔

ہمایوں کاشمیری اور افضال ایڈووکیٹ عدالت کا شکریہ ادا کر کے باہر نکلے۔ افضال ایڈووکیٹ ضمانت نامہ خریدنے چلا گیا اور ہمایوں ضمانتی کا بندوبست کرنے کے لیے بھاگ دوڑ میں لگ گیا، لیکن عدالت کا وقت ختم ہو گیا۔

ہمایوں کاشمیری عدالت سے تھکا ہوا آیا تو اس نے شام کو بڑے ہی درد بھرے لہجے میں کہا۔

دیکھو مجھ سے کیسی غلطی ہونے والی تھی۔ میں شاید عمر بھر اس بوجھ کو محسوس کرتا رہوں۔

یہ ایک المیہ ہے کہ اس شہر میں ساغر کی تین ماہ تک ضمانت نہ ہو سکی۔ اور وہ تین ماہ تک لاہور کیمپ جیل میں رہا، پولیس نے سرکاری کارروائی، کاغذوں کی تبدیلی اور باقی ملزموں کے مسائل کو اس سلسلے میں بڑی اہمیت دی۔ چالان پیش کرنے میں دیر بھی ہوئی اور ساتھ ہی ضمانتی بھی نہ مل سکا۔

ساغر وہی مقام ہے اِک منزلِ فراز
اپنے بھی جس مقام پہ بیگانے بن گئے

تین ماہ بعد وہ کیمپ جیل سے باہر نکال دیا گیا تو شہر کی طرف پیدل آتے ہوئے اسے کئی بار اس تجربے کی یاد نے گھائل سا کر دیا۔

وہ منظر ابھی تک میرے ذہن میں تازہ ہے۔ گرمیوں کی اس شام کو وہ انارکلی میں گوشۂ ادب کے سامنے کھدر کا پاجامہ اور کرتہ پہنے کھڑا تھا۔ وہ تیزی سے میری طرف بڑھا اور ہاتھ ملا کر بولا "تم نے اس لیے برسوں پہلے مجھے اس شہر میں ٹھہرنے کی دعوت دی تھی۔ خیر کوئی بات نہیں۔" جیل میں تین ماہ گذارنے کی اذیت اس کے چہرے سے پوری طرح عیاں تھی، اس نے کیفے ڈی سٹال میں جیل کے دنوں اور راتوں کو شمار کرتے ہوئے کہا۔

مجھے ریڈنگ روم میں سنا ہوا ٹالسٹائی کے ناول کا پیرا بہت یاد آتا تھا۔ جس طرح انہوں نے حضرت عیسیٰ کو مصلوب کیا تھا۔ وہ اسی طرح مجھے سولی پر چڑھانے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ مجھے پکڑ کر عدالتوں میں لے جاتے ہیں۔ اور ایک بار انہوں نے مجھے پاگل خانے پہنچا دیا۔ مگر وہ کچھ نہیں کر سکتے، کیونکہ میں آزاد ہوں۔

وہ کہتے ہیں تمہارا نام کیا ہے۔

میں کہتا ہوں۔ میرا کوئی نام نہیں۔ میں سب کچھ ترک کر چکا ہوں۔ میرا کوئی ٹھکانہ نہیں، کوئی وطن نہیں۔ میں صرف میں ہوں اور زمین میری ماں ہے اور باپ آسمان ــ

ہوں نہ ساغر جس میں سنگ و میل کی پابندیاں

منزلوں تک ایک ایسی رہگذر بھی چاہیے

اسی شہر میں جہاں وہ جرمِ زیست کا چارہ کرتے کرتے قید کر لیا گیا تھا عظیم عظمتوں کے خواب لے کر آیا تھا۔

۱۹۴۷ء سے پہلے بھی ہر اتوار آیا کرتا تھا۔ میں اس شہر میں اس کی گذری ہوئی زندگی کے صبح و شام کی بکھری بکھری کہانیاں ترتیب دے رہا ہوں تو ۱۹۴۶ء کی اتوار کی وہ صبح میری یادوں کے آئینے میں سنہری سپنوں کی طرح پھیل گئی ہے۔ جب دہلی دروازہ کے باہر حلقہ اربابِ علم کے تنقیدی اجلاس شروع ہونے میں ابھی کافی دیر تھی۔ شاہ محمد غوث لائبریری کے پیچھے دارالعلوم السنۂ شرقیہ کے برآمدے میں ساغر صدیقی، حافظ امرتسری کے ساتھ کھڑا تھا۔ اس کے تیکھے خد و خال اور سنہری سانولی رنگت میں بے پناہ کشش تھی اور گھنگھریالے بالوں کی لٹیں اس کے ماتھے پر جھول رہی تھیں۔ اس نے سفید جوتے، سفید پاجامہ اور سیاہ شیروانی پہنی ہوئی تھی اور گولڈ فلیک کے سگریٹوں کی ڈبی اس کے ہاتھ میں تھی۔ میں اور اطہر نظامی برآمدے میں داخل ہوئے تو نظامی اسے دیکھ کر جلدی سے آگے بڑھا اور اسے گلے سے لگا کر بولا۔ "آؤ ساغر کیا حال ہے" ساغر نے مسکرا کر کچھ سوچتی ہوئی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا اور انتہائی پیار بھرے لہجہ میں اس نے جواب دیا۔ "بالکل ٹھیک ہوں نظامی۔ تم سناؤ" پھر اس نے مسکراہٹ کے ساتھ مجھے دیکھا اور بھرپور اپنائیت سے ہاتھ ملا کر بولا۔ "میرا نام ساغر صدیقی ہے" یہ میرا اس سے پہلا تعارف تھا۔ اجلاس شروع ہوا تو سب سے آخر میں ساغر نے غزل تنقید کے لیے پڑھی۔ اس کے گلے میں سے ستار کے سُر نکل کر فضا میں پھیل گئے اور اس کی آواز کے سوز نے سب کو دم بخود کر دیا۔ غزل پڑھنے کے بعد وہ سر جھکا کر بیٹھا رہا اور سگریٹ پیتا رہا۔

دوسرے روز وہ امرتسر چلا گیا لیکن اس کی مستی بھری آنکھوں کے اندر چھپی ہوئی سنجیدگی بہت یاد آتی رہی ان دنوں بیسہ اخبار میں حافظ امرتسری کی دکان ادیبوں اور شاعروں کا مرکز تھی جہاں اطہر نظامی، نعیم ہاشمی، شوراج بہار امرناتھ سرشار اور دوسرے شاعروں اور ادیبوں سے ملاقات ہوتی تو ساغر کا ذکر بھی آجاتا اور اطہر نظامی فوراً کہتا "میں نے اسے خط لکھ دیا ہے بس وہ آنے والا ہی ہے"۔ ان دنوں علمی ادبی سرگرمیاں کا مرکز پیسہ اخبار تھا۔ اور میں اطہر نظامی کے ساتھ روزانہ پیسہ اخبار میں جاتا تو میری خواہش ہوتی کہ ساغر بھی کہیں امرتسر سے آجائے تو نظام ہوٹل میں بیٹھ کر چائے پئیں اور اس سے باتیں کریں ان دنوں لاہور میں سیاسی سرگرمیاں بڑھتی جا رہی تھیں اور پاکستان کے قیام کے نعرے سنائی دے رہے تھے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں سرد جنگ شروع ہو چکی تھی اور ہم ہسپتال روڈ پر گورو گھنٹال (ہفت روزہ) کے دفتر میں بھی روزانہ جاتے تھے۔ وہاں بھی شاعروں، ادیبوں اور صحافیوں کی آمد و رفت رہتی تھی۔ ایک روز گورو گھنٹال کے ایڈیٹر امرناتھ نے بتایا کہ ساغر صدیقی آیا ہوا ہے اور پالسرور ہوٹل میں ہے۔ میں اور اطہر نظامی میکلوڈ روڈ پر پالسرور ہوٹل میں گئے تو ساغر دوسری منزل کے درمیانی کمرے کے برآمدے میں کرسی پر بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا۔

کمرے میں دیکھ کر کاغذ سمیٹا اور پنسل جیب میں ڈالی، پھر بڑے خلوص سے

ہاتھ ملایا اور ہم کمرے میں آ گئے۔ ساغر نے فوراً چائے منگوائی اور باتیں کرنے لگا
میں ایس پی ایس کے ہال میں مشاعرہ پڑھنے آیا ہوں۔

"ہاں۔ مجھے معلوم ہے۔ میں نے کہا، مجھے حافظ صاحب کی دکان پر کسی نے بتایا تھا کہ کوئی بہت بڑا مشاعرہ ہونے والا ہے۔"

آپ کیا کرتے ہیں؟ ساغر نے اطہر نظامی سے میرے بارے میں سوال کیا

ابھی ابھی تعلیم سے فارغ ہوا ہوں۔ میں نے جواب دیا

کیا شاعری سے دلچسپی ہے۔ ساغر نے پوچھا۔

جی نہیں صرف نثر لکھنے کا شوق ہے۔

مانسرور ہوٹل میں اطہر نظامی اور میں نے کافی وقت ساغر کے ساتھ گذارا اور دوسرے دن شام کو موری دروازہ کے باہر ایس پی ایس کے ہال میں مشاعرہ شروع ہوا تو اس میں جگر مراد آبادی اور پنڈت آنند نارائن ملا جیسے قد آور شاعر بھی شریک تھے۔ ساغر نے جب غزل پڑھی تو ہال تڑپ اٹھا، جگر مراد آبادی اپنی جگہ سے اٹھے ساغر کا ماتھا چوما اور اس کی والہانہ تعریف کی۔

مشاعرے کے بعد وہ دو تین دن تک لاہور میں رہا، میں روزانہ اُسے ملنے مانسرور ہوٹل میں چلا جاتا یا وہ مجھے پیسہ اخبار میں مل جاتا۔ اس کے پاس ڈھیر سارے روپے تھے۔ ہم دونوں تانگے کی سیر کرتے، انار کلی کے ہوٹلوں کہکشاں، سیچشک اور نظام ہوٹل میں بیٹھتے، ایک روڈ پر ایک ویشنو ہوٹل تھا۔ وہاں خان غازی کابلی روزنامہ اجیت کا ایڈیٹر ہر بھگوان شاد بیسویں صدی کے خورشید گرامی۔ کھانا کھانے آتے تھے اور اچھی خاصی ادبی محفل کا سماں پیدا ہو جاتا تھا۔ ساغر کے ساتھ مشاعرے کے بعد زیادہ ملاقاتیں ویشنو ہوٹل میں ہوئیں اور نوخیز سی دوستی میں بدل گئیں۔

چوتھے روز میں اسے امرتسر جانے والی گاڑی میں سوار کروانے سٹیشن پر گیا تو وہ بہت ہی اداس تھا۔ اس نے پلیٹ فارم پر ٹہلتے ہوئے کہا۔

"لاہور بہت یاد آئے گا۔"

"میں نے جواب دیا۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم لاہور آ جاؤ۔ اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پلیٹ فارم سے باہر دیکھا اور آہستہ سے کہا

"یوں لگتا ہے، لاہور کی مٹی مجھ پہ عاشق ہو گئی ہے۔ میں امرتسر جاتا ہوں تو یہ مجھے اپنی طرف کھینچتی ہے۔ لیکن تم بھی تو کبھی امرتسر کا پھیرا لگاؤ۔"

ہاں ہاں ایسا ہو سکتا ہے لیکن میری ماں ذرا بیمار ہے ورنہ۔؟

میری بیماریاں کا ذکر سن کر لاہور سے عشق کی جولانی پھیکی پڑ گئی اور اس کے چہرے پر ایک عجیب قسم کی اداسی پھیل گئی، جیسے اسے اپنی ماں یاد آ گئی ہو۔ کم سے کم میں یہی سمجھا تھا۔ گاڑی جانے میں کافی دیر تھی۔ اور ہم ایک نمبر پلیٹ فارم پر ٹہلتے ہوئے دور تک نکل گئے۔ پلیٹ فارم کی چھت سے باہر سگنلوں اور لالٹینوں کے دیکھتے رہے۔ ساغر سنجیدگی کی حد تک چپ تھا اور مسلسل سگریٹ پی رہا تھا۔ ساغر بہت چپ تھا۔ اچانک میں نے پوچھا۔ اس نے کچھ کہنا چاہا تو پلیٹ فارم پر آنے والی کسی گاڑی کی گڑگڑاہٹ میں اس کی آواز دب گئی اور جب شور ختم ہو گیا تو میں نے کہا

تم کچھ کہنا چاہتے تھے؟ ساغر

نہیں صرف یہ کہنا چاہتا تھا کہ تمہاری ماں ہے۔ کتنے خوش قسمت ہو

ساغر نے جواب دیا۔

تو کیا تمہاری ماں نہیں ہے۔؟

ساغر نے میری طرف دیکھا اور کہا، ان آنکھوں نے کسی ماں کا چہرہ نہیں دیکھا کہ ماں کیسی ہوتی ہے؟"

ہم واپس پلیٹ فارم کے اندر آ گئے ۔ امرتسر جانے والی گاڑی پلیٹ فارم پر آ لگی تو ساغر نے ایک ڈبے میں کھڑکی کے ساتھ ٹھکانہ بنا لیا اور میں پلیٹ فارم پر کھڑے ہو کر اس سے باتیں کرنے لگا ۔

پھر کب آؤ گے ۔

کیا خط لکھو گے ؟

ساغر کی بڑی بڑی نشہ آور آنکھوں میں کوئی جواب نہیں تھا ۔ گاڑی چلنے لگی تو اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور کہا ۔ میں لاہور کو اپنے دل میں بسا کر جا رہا ہوں ۔

۱۹۴۷ء برصغیر میں تاریخی تبدیلیوں کا سال ہے

میری ماں اور میرا بھائی مجھے ساتھ لے کر بمبئی کی طرف روانہ ہو گئے جہاں میری منجھلی بہن رہتی تھی اور مجھے اپنے ساتھ لے جانے کی ایک وجہ فساد تھا اور میری ماں کا یہ خیال تھا کہ لاہور میں رہنے سے میں بھی فساد کی زد میں آ جاؤں گا لاہور سے بمبئی اور بمبئی سے لاہور واپسی کا سفر دکھ دینے والی یادوں کی کہانی ہے ۔ میرے اداکار بننے کے خواب برباد ہو گئے تھے اور میں ۱۹ دسمبر ۱۹۴۷ء کو ایک ریفیوجی ٹرین میں لاہور پہنچا تو لاہور میں جلی ہوئی عمارتوں سے دھواں اٹھ رہا تھا اور مہاجرین کے قافلوں اور لٹے پٹے گھرانوں کے لوگوں سے شہر کا نقشہ بدلا ہوا تھا ۔

ہمارے گھر کے ساتھ ہندوؤں اور سکھوں کے سارے گھر شائیں شائیں کر رہے تھے اور ان میں بسنے والے لوگوں کے چہرے بار بار یاد آ جاتے تھے میں چند دنوں تک اپنی بڑی خالہ کے پوتے کے ساتھ جو میرا ہم نام ہی تھا ، تباہ حال گلیوں اور بازاروں میں گھومتا رہا ۔ پھر میں نے اطہر نظامی کے ساتھ دوبارہ پیسہ اخبار میں جانا شروع کر دیا جہاں مشرقی پنجاب اور دہلی ، مظفر نگر سہارنپور ، بمبئی اور وسط ہند کے شہروں سے آنے والے مہاجر ادیبوں شاعروں سے تعارف ہونے لگا ۔ لیکن ساغر کا کوئی پتا نہیں تھا ۔ پرانا لاہور مٹ رہا تھا اور نیا لاہور تیزی سے ابھر رہا تھا ۔ میرے بڑے بھائی بیکار تھے اور میرے سامنے یا تو پوسٹ مین کی نوکری تھی یا پٹواری کی ، میرا خالہ زاد مجید مجھے پٹواری کی نوکری کا انٹرویو کروانے لے گیا لیکن میں نے اپنے محلے کے ڈاکٹر اشرف کے ذریعے

نیشنل بینک آف انڈیا میں ملازمت کر لی اور بینک سے فارغ ہو کر میں سیدھا انار کلی آ جاتا۔ سیچشک ہوٹل، کیفے تاں ہوٹل اور نظام ہوٹل میں بیٹھنے والے ادیبوں اور شاعروں سے ملنے چلا جاتا۔

ایک شام میں اکرام لدھیانوی، نعیم ہاشمی، محوی منظر نگری اور فدا شاہجہاں پوری کے ساتھ سیچشک ہوٹل میں بیٹھا تھا کہ شیشوں والے دروازے سے مجھے ساغر گذرتا ہوا نظر آیا۔ وہی ساغر گھنگھریالے بالوں، خوبصورت آنکھوں اور دلکش فنکارانہ خدوخال والا ساغر۔ لیکن کسی گہرے زلزلے کی زد میں تھا۔ اس کی مستی بھری آنکھوں میں سنجیدگی زندگی کے نئے عنوان بتا رہی تھی۔

میں اسے سیچشک ہوٹل میں لے آیا۔ فدا شاہجہان پوری۔ نعیم ہاشمی اور اکرم لدھیانوی اسے پہلے سے جانتے تھے۔ کچھ اِدھر اُدھر کی باتیں ہوئیں۔ اکرم نے پوچھا۔

"امرتسر سے کیسے آئے ہو؟"

بس آ گیا ہوں۔ کیا بتاؤں کس زخمی احساس کے ساتھ آیا ہوں لیکن یہ... اب اجنبی نہیں لگتا۔

ساغر اب روزانہ ملنے لگا تھا، وہ دیو سماج روڈ پر ایک متروکہ بلڈنگ کے کمرے میں ٹھہرا ہوا تھا۔ نئی سرزمین پر نئی زندگی شروع کرنے کے لیے اس کے ذہن [میں] کچھ بھی نہیں تھا لیکن کچھ دنوں بعد پاکستان میں ایک نئی زندگی کی تعمیر کے نئے جذبوں سے سرشار ساغر صدیقی اپنے تخلیقی پر جوش سے ہم آہنگ ہو گیا [اور] ادبی حلقوں اور مشاعروں میں اپنے لہجے کی کھنک اور خیال کے تجربوں [کی] ندرت سے اس نے گہری جان پہچان حاصل [کر] لی تھی اور لاہور میں تقسیم

ہنگاموں کی گرد آہستہ آہستہ بیٹھ رہی تھی۔ متروکہ جائیدادوں کی الاٹمنٹ کلیموں کی منظوری اور ملازمتوں کے حصول کی جدوجہد نکتۂ عروج پر پہنچ گئی تھی لیکن ساغر اپنے شعری تجربوں میں والہانہ سفر کر رہا تھا۔

ہم تقریباً روزانہ ملتے تھے۔ دوستی کے دائرے میں نئے نئے چہرے شامل ہو رہے تھے۔ بینک ملازمت کے ساتھ ساتھ ادبی مصروفیات بھی میری دلچسپی کا مرکز تھیں۔ دن بھر کے بعد شام کو انار کلی کے ہوٹلوں میں شاعر، ادیب، فنکار اور صحافی جمع ہوتے تھے۔ نگار نما متاز ہوٹل وجود میں آ چکا تھا اور لاہور کے مختلف علاقوں میں ادبی محفلیں اور مشاعرے منعقد ہونا شروع ہو گئے تھے جن میں ساغر صدیقی کے ساتھ نمودِ سحر کی طرح محسوس کیا جانے لگا جاتا تھا۔ اس کے شعر اس کے خیال اور اس کے ترنم کی سچائی نے اسے بہت جلد دوسرے شہروں میں بھی متعارف کروا دیا تھا۔

ساغر نے شاعرانہ توانائیوں کے ساتھ لاہور میں قدم رکھا تھا اور اپنے لفظوں سے اس دھرتی کو سجانے کے لیے اس کے پاس صرف خوبصورت جذبے تھے۔ فکر و خیال کے تجربے اور اس کے فنکارانہ اظہار کی ترتیب ساغر کا کل سرمایہ تھا۔ وہ توانا جذبوں اور مستقبل کے خوبصورت خاکوں کا خالق تھا۔

ہم یہاں ساغر بنائیں گے نئی تصویرِ شوق
ہم تخیل کے مجدد، ہم تصور کے امام

ابھی تک لاہور کے سینے پر تباہ شدہ مکانوں کے ملبے کے پہاڑ کھڑے تھے لیکن دھواں نکلنا بند ہو گیا تھا۔ نئے وطن کی آرزو میں سلگتے ہوئے چہروں کی فسردگی۔ نئی نئی کہانیوں کو جنم دے رہی تھی۔ واہگہ بارڈر سے آنے والے فنکار،

ادیب اور شاعر بڑی شدت کے ساتھ چھوڑے ہوئے نشانوں اور مانوس بسیروں سے ٹوٹنے والے رشتوں کے المیے میں گم تھے۔ لیکن ساغر کو سہارنپور، انبالہ اور امرتسر کی آغوش میں گذرا ہوا زمانہ کبھی یاد نہ آیا۔

ایک نئی زندگی کی تعمیر اس کے شوقِ آرزو کی منزل تھی اور پاکستان اس کے قلب و نظر کی وسعتوں میں رچا بسا تھا۔ در و بام کی تقسیم اور آشیانوں کی الاٹمنٹ کے عمل سے بے نیاز ساغر نئے وطن کی عظمتوں کے ابدی نغمے تخلیق کر رہا تھا اور اس کے شعری ریاض کی سچائی اور اس کے شاعرانہ مزاج کے کھرے پن کی گونج دور دور تک سنائی دے رہی تھی۔ ادبی محفلوں اور مشاعروں میں آتا تو ان گنت آنکھیں اسے دیکھنے لگتیں۔ شاعرانہ سچائی سے سجی ہوئی اس کی شخصیت میں عجیب شان سی ابھرتی چلی گئی اور وہ احساس پر چھا جانے والے اپنے سرمدی ترنم سے ہمکلام ہوتا تو سماعتیں مدہوش ہو جاتیں۔

ایک دن شام کو ہم دیو سماج روڈ کی طرف جانے والے راستے پر چل رہے تھے کہ کچہری کے قریب سے گذرتے ہوئے اکرام نے اچانک اپنی الاٹمنٹ کا ذکر چھیڑ دیا اور بتایا۔

"میرا نو لاکھ کا کلیم منظور ہو گیا ہے۔"

ساغر نے نو لاکھ کے کلیم کے لفظ سُنے اَن سُنے کرتے ہوئے چوک عبور کیا تو اکرام نے پھر کہا۔ ساغر تم بھی اپنے لیے کوئی گھر الاٹ کروا لو۔

اس نے ہنس کر کہا۔ پیارے سارا پاکستان میرا گھر ہے۔

"لیکن تم کوئی کام دھندہ کیوں نہیں شروع کر لیتے۔ اکرام نے ایک اور تیر پھینکا تو اس نے چلتے چلتے رک کر کہا۔

"شعور شعر سے بڑا کام اور کیا ہو سکتا ہے۔ شعور ہی زندگی ہے اور شاعری بڑا انجام ہے۔ میں اپنے خیال اور احساس سے کیسے دامن چھڑا لوں!"

ان دنوں سارے پاکستان کو اپنا گھر سمجھنے والا شاعر پاکستان کا قومی نغمہ تخلیق کر رہا تھا۔

میں نے بنک کی ملازمت چھوڑ کر بنک کے کیشئر رحیم کے تعاون سے ایک برطانوی فرم میں ملازمت حاصل کر لی تھی۔ تنخواہ بنک سے زیادہ تھی اور ماحول بڑا صاف ستھرا تھا۔ اور ساغر بھی پھرتا پھرتا مال پر آ جاتا۔ چھٹی کے بعد میکلوڈ روڈ پر چلے جاتے۔ بحرین میں حال مقیم سعید قلیس بھی ہماری دوستی کی تکون کا ایک زاویہ بنا ہوا تھا۔ وہ بڑا عمدہ ٹائپسٹ تھا اور بحرین سے ایک ایرانی بیوی لاہور میں لا کر بیکاری کے مزے لوٹ رہا تھا۔ شاعری کرتا تھا اور ہمارے ساتھ فلمیں بنانے، اخبار نکالنے، کتابیں شائع کرنے کے منصوبے بنایا کرتا تھا اور ساغر سے کہا کرتا تھا۔

"ساغر صاحب میں ایک مرتبہ دوبارہ بحرین چلا گیا تو اتنی دولت کما کر لاؤں گا پھر ایک نہیں تین چار فلمیں بنائیں گے، اسے فلمی گیت نگار بننے کا شوق تھا اور ساغر سے اصلاح لیا کرتا تھا۔

ساغر سے ہماری ملاقاتیں کم ہونے لگی تھیں اور وہ۔ بمبئی کی فلمی دنیا سے اپنا رشتہ توڑ کر پاکستان آنے والے نعیم ہاشمی، خدا شاہ جہانپوری اور محوی مظفر نگری کے ساتھ قومی نغمے کو سلولائڈ پر اتارنے کے انتظامات میں مصروف تھا۔

یہ بڑی عظیم جدوجہد تھی جس کی تکمیل کے لیے ان فنکاروں کے پاس صرف خلوص تھا۔ جس روز لوگوں نے فلم کے اختتام پر ساغر کی آواز میں ساغر کا نغمہ قائد اعظم کی تصویر اور قومی پرچم کے پس منظر میں دیکھا تو دیو سماج

روڈ کی ایک متروکہ عمارت کے اس کمرے پر نئے الاٹیوں نے قبضہ کر لیا ہوا تھا۔ جس میں ساغر مقیم تھا۔

وہ کپڑوں کی گٹھڑی اٹھائے انارکلی سے گزر رہا تھا تو کسی نے روک کر پوچھا۔

"ساغر کہاں جا رہے ہو۔"

"جانا کہاں ہے، ابھی تو ہجرت مکمل نہیں ہوئی۔" اکرام لدھیانوی نے اسے اپنے والد صوفی برق کے آستانے میں پہنچا دیا جو سرحد پار سے آنے والے اہل علم و دانش اور صوفیا کا ٹھکانہ بنا ہوا تھا۔

ساغر حیات و کائنات کے اسرار و رموز سے معمور بحثوں اور مذاکرات کے طویل لمحوں میں کھویا رہتا یا انارکلی کے ہوٹلوں میں گردش کرتا۔

انارکلی میں ڈاکٹر برق کے آستانے کے پیچھے ایک کیفے کھل گیا تھا اور شام کو وہاں ادبی محفلیں شباب پر ہوتی تھیں۔

ساغر بھی ان میں شریک ہوتا لیکن رفتہ رفتہ معاشی مسائل کے الجھے ہوئے سلسلے نے اس کی ذات پر گہرے اثرات مرتب کرنے شروع کر دیئے۔

مشاعروں میں شرکت سے جو کچھ اسے ملتا وہ اتنا ناکافی ہوتا کہ وہ اس کے ختم ہوتے ہی ایک نہ ختم ہونے والے کرب کے ہجوم میں پھنس جاتا۔ لیکن اس نے اپنی تخلیقی سرجوشش پر اقتصادی ناہمواری کو غالب نہ آنے دیا اور جب وہ آزاد کشمیر کے ایک مشاعرے سے واپس آیا تو کیفے جالندھر میں نعیم ہاشمی اور فدا شاہجہانپوری کے ساتھ انقلاب کشمیر پر دستاویزی فلم بنانے کی گفت گو اس کا مقصد بن گئی۔ انہوں نے آزاد کشمیر کے دوستوں اور لاہور میں کچھ حلقوں سے رابطہ قائم کیا اور مالی سرپرستی کے وعدوں سے

خوش ہو کر انہوں نے سکرپٹ پر کام کرنا شروع کر دیا۔

اسی دوران ساغر نعیم ہاشمی کے ساتھ مظفر آباد بھی گیا اور لاہور کے نگارخانے میں فلم کی رسم افتتاح بھی ہوئی۔ ساغر بہت ہی مصروف ہو گیا تھا۔ میں اخباروں میں انقلاب کشمیر کے عنوان سے بننے والی فلم کی خبریں پڑھتا تو مجھے یوں لگتا جیسے ساغر قومی فلمی صنعت کی بنیادیں تعمیر کر رہا ہے۔

میں دفتر سے فارغ ہو کر میکلوڈ روڈ کا چکر لگا کر انارکلی میں آتا تو ساغر کے بارے میں یہی معلوم ہوتا کہ وہ اسٹوڈیو میں ہے یا مظفر آباد گیا ہوا ہے۔ لیکن وہ ہفتے دو ہفتے بعد صوفی برق کے آستانے پر ضرور مل جاتا۔ اپنا حال سناتا میرا حال سنتا اور اپنے پرنور خوابوں کی باتیں کرتا کرتا سرشار ہو جاتا جیسے اسے اپنے خیالوں کی بہشت تعمیر کر لی ہو۔ لیکن اس کے پاس صرف خوبصورت خیال اور سنہری خواب تھے۔ دیکھتے دیکھتے اس کے خوشبوؤں، نغموں اور رنگوں سے سجے ہوئے خوابوں کے گلاب مرجھا گئے۔

انقلاب کشمیر پر بننے والی فلم کا منصوبہ مالی امداد سے محرومی کے باعث ادھورا رہ گیا تو نعیم ہاشمی نے اسٹوڈیو میں ہی ٹھکانا بنا لیا۔ فدا شاہجہانپوری کراچی چلا گیا اور ساغر دوبارہ صوفی برق کے آستانے کا مستقل باسی بن گیا۔ ساغر کی زندگی کے صبح و شام میں ایک اور موڑ پیدا ہوا۔ اس نے شباب کیرانوی کے خواجہ دل محمد روڈ پر ہفت روزہ تصویر کی ادارت سنبھال لی۔ میں دوسرے تیسرے تصویر کے دفتر میں جاتا تو ساغر وہاں موجود ہوتا۔

ہفت روزہ تصویر بھی ساغر کے سفر میں دور تک ساتھ نہ دے سکا اور کچھ دنوں بعد انارکلی میں سے گذر رہا تھا تو ایک پیار کرنے والے نے اسے کچہری میں سے جاکر ہفت روزہ فلمی اخبار کا ڈیکلریشن لے دیا۔ ساغر ڈیکلریشن لے کر باہر نکلا تو اس کے ذہن میں اس ہفت روزہ فلمی اخبار کے بارے میں نئے نئے خاکے بننے لگے۔

شام کو اس نے مجھے میجسٹک ہوٹل میں تلاش کر لیا اور ہم دونوں لاہوری کے اندر سنیاری چوک کے قہوہ خانے میں چلے گئے۔ ساغر نے ڈیکلریشن میرے سامنے رکھ کر کہا۔

"یہ کاغذ کا پرزہ بڑی اہمیت رکھتا ہے اور میں کوشش کروں گا کہ اس ہفت روزہ کو زندہ رکھوں۔"

ساغر اس ہفت روزہ کو چلانے کے لیے بڑا ولولہ انگیز اور پرجوش تھا۔ اور اس نے مجھے بتایا کہ وہ فلمی نگار خانوں میں جایا کرے گا۔ وہاں اپنے نمائندے مقرر کرے گا۔ اور فلمی اخبار کو پاکستان کی فلمی صنعت کا ترجمان بنانے کے لیے دن رات محنت کرے گا۔

فلمی اخبار نکالنے کے لیے انارکلی کے سرے پر مائل ہوٹل میں دفتر بنانے کا فیصلہ کیا گیا اور ہوٹل کی سیڑھیوں میں بک سٹال والے غلام جیلانی کو سول ایجنٹ بنایا گیا جو اخبار مارکیٹ میں صبح ہی صبح اخبار فروشی بھی کرتا تھا۔

ہم دونوں نے فلمی اخبار کو مرتب کرنا شروع کر دیا۔ ساغر نے کہیں سے دو رم کاغذ حاصل کیے اور کتابت شدہ کاپیاں تیار ہو گئیں تو ساغر انہیں چھپنے کے لیے پریس میں دے آیا۔

ہم پہلا شمارہ دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور فلمی نگار خانوں میں گھومنے لگے فلمی صنعت ابھی اپنے بچپن میں تھی۔ دوسرا شمارہ کچھ اشتہاروں کے ساتھ شائع ہوا لیکن اشتہاروں کی ادائیگی میں دیر کی وجہ سے ساغر تیسرا شمارہ نہ نکال سکا۔ ہم دو تین ہفتوں تک نگار خانوں میں جاتے رہے اور اس کے بعد ایک روز رائل ہوٹل کے تھڑے پر غلام جیلانی نیازی نے ساغر سے اس ہفت روزہ کو دو روپے میں خرید لیا اور ہم کچھ دوست ممتاز ہوٹل میں روزانہ بیٹھتے تھے اور ساغر بھی کبھی کبھی ممتاز ہوٹل میں چکر لگا لیتا تھا۔ وہ دوستوں اور جاننے والوں سے دامن بچانے لگا تھا۔ ممتاز ہوٹل میں ہم اسے زبردستی بٹھا لیتے اس سے شعر سنتے اور رات گئے ہوٹل سے باہر نکلتے تو ساغر اور میں اس سے جدا ہو کر سرکلر روڈ، کبھی ابکاری روڈ، فورٹ روڈ اور کبھی کسی روڈ پر نکل جاتے۔

میں محسوس کرنے لگا تھا کہ ہفت روزہ کے نیلام عام کے بعد ساغر انتہائی غیر محسوس طریقے سے ذہنی گمشدگی کی راہ پر چل نکلا تھا لیکن اس کے شعروں میں فکر و فن کے نئے نئے تجربے ابھرنے لگے تھے۔ وہ بہت کم باتیں کرنے لگا تھا اور اپنی ذات سے اس کی بیگانگی کا عمل تیز تر ہونے لگا تھا۔ وہ اندر ہی اندر گم ہو رہا تھا اس کی مستی بھری آنکھوں میں کھویا کھویا پن ایک پراسرار عنوان کی طرح نظر آتا تھا۔ اور یوں لگتا تھا، جیسے وہ اپنے خیال کی انوکھی راہوں پر رواں دواں ہو۔ کرب اضطراب اور ناکامیوں کے زخمی احساس کی پرچھائیں اس کے شعور پر حاوی ہوتی گئیں۔ اور میں یہ جاننے سے قاصر تھا کہ ساغر ذہنی پروسس کے کس مرحلے پر ہے۔ ملنے جلنے والوں میں اس کی علیحدگی پر بڑی لمبی چوڑی باتیں ہوتی تھیں۔

کچھ دوست اسے پاگل پن قرار دیتے تھے۔ کچھ اس کو ساغر کی مدہوشی

کا سبب بتاتے تھے۔ جس نے سارا سارا دن مدہوشی کے ٹھکانوں پر گزار نا شروع کر دیا تھا۔ اس کی آنکھیں خود اختیاری مدہوشی سے اضافی مستیوں کے سمندر بنتی جا رہی تھی۔ اس کی شبوں کے چہرے تاریک ہونے لگے اور شاموں کے غم گہرے ہونے لگے۔ شہر میں اس کا کوئی مستقل ٹھکانہ نہ تھا۔ نہ اس کی جیب میں تلہ تھا اور نہ کاغذ، وہ چلتے چلتے کہیں سے کاغذ اور پنسل مانگ کر اپنے ذہن کے عمل کو شعروں میں ڈھال کر لکھ لیتا۔ ادھر گلیوں بازاروں اور کوچوں میں گھومتا رہتا۔ دل چاہتا تو کسی ادبی محفل یا مشاعرے میں آنکلتا تو تازہ کلام کی فرمائشوں پر کچھ سنا کر باہر نکل جاتا۔

شہر کا ایک ناشر رہ و ناز اس کے خونِ دل کے چھینٹوں کو چائے کی پیالی اور سگرٹ کی ایک ڈبیا کے عوض خرید رہا تھا۔ اُس نے میز کی دراز میں ایک کاپی رکھی ہوتی تھی، وہ ساغر کو دکان کے سامنے سے گزرتا ہوا دیکھتا تو مصنوعی خلوص اور سر پرستانہ جعلسازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اُٹھ کر اُسے روک لیتا۔ دکان میں بٹھاتا، چائے کی پیالی پیش کرتا اور تازہ کلام سُننے کی خواہش میں اس پر سو جان سے فدا ہونے کے لیے تیار ہو جاتا۔ ساغر تازہ شعر سناتا۔ اور ناشر نیچے رکھی ہوئی کاپی میں چوری چھپے نوٹ کرنے لگتا۔ جب کوئی شعر لکھ نہ پاتا تو کہتا، "سبحان اللہ، ساغر صاحب، یہ آپ ہی کا حق ہے کیا شعر کہا ہے ذرا مکرّر ارشاد فرمائیں" ——— ساغر دوبارہ شعر سنا دیتا اور سگرٹ کی ڈبی کے ساتھ کبھی کبھی ایک دو روپے بھی لیکر باہر نکل آتا۔ اس طرح ایک روز ناشر نے ساغر کو پچاس روپے دیکر آمادہ کر لیا تو

وہ اس مجموعے کا نام تجویز کریں میں اسے شائع کروں گا۔ ساغر ہنس کر بولا، زہر آرزو کا اور کیا نام ہو سکتا ہے۔

ناشر نے ایک مہینے کے اندر اندر زہر آرزو کے نام سے ساغر کے کلام کا مجموعہ چھاپ کر مارکیٹ میں پھیلا دیا، پھر اسی طرح لوحِ جنوں اور شبِ آگہی کے نام سے دو اور مجموعے چھپ گئے تو شعر و ادب سے دلچسپی رکھنے والے ساغر کو تلاش کرتے کرتے ناشر کے دروازے آنے لگے۔ سارا سارا دن ناشر کی دکان پر گزارتے، اور ناشر کہتا، قبلہ وہ تو میرے پاس ہی بیٹھے ہیں۔ انہوں نے جانا کہاں ہے یہ تو میرا کمال ہے کہ میں نے ساغر کو گمنامی سے نکال کر ناموری کی دنیا میں پہنچا دیا ہے، میں تو صرف خدمت کر رہا ہوں۔

ساغر اس ناشر کی گفتگو پر بڑے طنزیہ انداز میں تبصرے کیا کرتا۔ "ہاں ——— بڑا دان کر رہا ہے مجھ پر، اگر وہ نہ ہوتا تو شاید ساغر کسی کو یاد بھی نہ آتا، وہ تو میرا خدا بن گیا ہے اور مجھے عزتیں دے رہا ہے، ذرا دیکھو، اس ستم ظریفی کی بھی کوئی حد نہیں"

ایک دن میں اُسے تلاش کرتا ہوا ریڈنگ روم پہنچا تو باغ میں کچھ لوگ دائرے کی صورت میں جمع تھے میں نے آگے ہو کر دیکھا تو ساغر ایک میّت کے سرہانے بیٹھا تھا۔ مجھے حیدر نے بتایا کہ رات ایک مزدور مر گیا ہے، بیمار تھا۔ اتنے میں اعجاز بھی آگیا۔ ساغر نے اُسے دیکھ کر کہا ——— سیّد زادے اس کے کفن کا بندوبست ہونا چاہیے۔ ہماری ذمہ داری ہے، کوئی بات نہیں اگر یہ مر گیا ہے لیکن اسے

شاید یہ میری ڈائری میں درج ہوکر یہ غلام محمد کا زمانہ تھا یا اسکندر مرزا کا...... زمانہ تو ایک ہی تھا۔ تاریک اور دکھی رات کے پچھلے پہر کی طرح اُداس اور نہ ختم ہونے والا زمانہ۔

موت کہتے ہیں جس کو اے ساغر
زندگی کی کوئی کڑی ہو گی

۱۹۵۲ء تک ایک برطانوی فرم میں ملازمت کے بعد میں کہیں بھی کسی باقاعدہ روزگار سے منسلک نہیں ہو سکا تھا اور ریڈنگ روم میں ساغر سے مری ملاقاتوں کا سلسلہ اتفاقیہ تو نہیں تھا لیکن مسلسل بیکاری اور اکلاپے پن نے بھی مجھے ساغر سے وابستہ کر رکھا تھا۔ اُس سے ملے بغیر دن پھیکا پھیکا لگتا تھا، کیونکہ وانگہ باڈر کے وجود میں آنے سے پہلے ہی ہم ایک دوسرے کو جانتے تھے اور دوستی کے ایک بے ریا رشتہ میں بندھے ہوئے تھے، وہ کئی بار مجھے کسی اخبار میں ملازم ہونے کے طریقے بھی سمجھایا کرتا تھا اور میں ہنس دیا کرتا تھا۔ اُن دنوں علم و فن سے ہی ایک ایسا لگاؤ تھا۔ جو بے معنویت کے احساس کو پیدا ہی نہیں ہونے دیتا تھا اور اگر بے معنویت کا احساس زیادہ طاقت ور ہوتا تو ہم شعر و ادب ہی کی پناہ لیتے، ذہن میں ہزاروں خوبصورت خیالات جنم لیتے تھے جن کو مربوط کرنے کی آرزوئیں رکاوٹوں کی دیواروں سے ٹکرا کر رہ جاتیں اور میں بھی سمجھ رہا تھا کہ ریڈنگ روم کے مناظر مستقل نہیں ہیں۔ ہم میں سے کوئی بھی کسی وقت خارجی حالات کے دباؤ میں اس

کے دائروں سے نکل سکتا ہے، کیونکہ میں خود ریڈنگ روم کی ایک جیسی فضا سے اُکتا گیا تھا اور اگر ساغر وہاں نہ ہوتا تو شاید میں بھی اس طرف کا رُخ نہ کرتا۔

ریڈنگ روم میں آہستہ آہستہ ساری کشش ساغر میں منتقل ہو گئی تھی۔ اگر وہ نہ ملتا تو اس کے انتظار میں ریڈنگ روم کے برآمدوں سے باتیں کرنا میرا معمول ہو گیا کیونکہ حیدر نے اچانک ریڈنگ روم بند ہونے پر کوٹھڑی کو تالا لگا کر غائب ہونا شروع کر دیا تھا اور شہر گردی کے بعد حیدر کی کوٹھڑی میں محفل منعقد ہونے کے امکانات ختم ہو گئے تھے۔ ساغر اس صورتِ حال سے خاصا پریشان تھا، اور وہ بھی دن کے وقت یہاں سے غائب رہنے لگا تھا لیکن گہری شام کے بعد جب کوئی بھی وہاں نہ ہوتا۔ ساغر کو حیدر کی کوٹھڑی ضرور کھلی مل جاتی اور وہ خاموشی کے ساتھ ایک کونے میں دبک جاتا ——— جب پوری طرح سردیاں بیت گئیں تو ریڈنگ روم کے آس پاس نئی نئی تبدیلیاں رونما ہونے لگیں شیخو پہلوان کے اکھاڑے میں رونق بڑھ گئی اور باغوں میں مالش کرانے والے آ گئے۔ حیدر نے سارا دن کوٹھڑی میں رہنا شروع کر دیا اور دوبارہ اِدھر اُدھر سے بکھرے ہوئے دوستوں نے بھی ریڈنگ روم کا پھیرا لگانا شروع کر دیا ——— ساغر کے پاس ایک بہت ہی خوبصورت کمبل تھا، جو اس نے بڑے شوق سے خریدا تھا اور اسے اس بات کا بڑا رنج تھا کہ شہر میں ہر کوئی اس سے یہ کمبل خریدنے کا منصوبہ بنا رہا تھا، ساغر کو اس کمبل سے بے حد پیار تھا۔ وہ اچھے موڈ میں ہوتا تو کمبل پر

ہاتھ پھیر کر کہتا۔ یہ زندہ اون کا کمبل ہے"۔۔۔۔۔ لیکن جو نہی سرد ہوائیں چلنا بند ہو گئیں تو ساغر کمبل کے بوجھ سے آزاد ہو گیا۔

ایک دن شام سے کچھ پہلے ہم باغ میں گلابوں کے پاس بیٹھے تھے تو ساغر بغیر کمبل کے باغ کی درمیانی سڑک پر نظر آیا، اس وقت احمد نثار، حمید، شبیر بجلی والا اور میں ایک افسانے پر بات کر رہے تھے۔ حمید نے ساغر کے شانوں کو کمبل کے بغیر دیکھا تو پوچھا

کمبل کہاں چھوڑ آئے ہو بابا۔۔۔۔؟

کہاں چھوڑنا ہے بابا۔۔۔۔؟ سارا شہر اس کمبل کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑا ہوا تھا۔ اور وہ یوسف تو دامن گیر ہی ہو گیا تھا اور جب بھی ملتا یہی کہتا، ساغر! کمبل بیچنے کی نوبت آ جائے تو میرے پاس لے آنا۔۔۔۔ سو میں کمبل اس کے پاس چھوڑ آیا ہوں۔

ساغر نے شکایت بھرے لہجے میں ایک لمبی ہُوں کی آواز نکالی اور بولا! "لوگ فقیر کا کمبل تک خرید لیتے ہیں" گرمی کا موسم آہستہ آہستہ جوان ہو رہا تھا۔

میں اکیلا ہوتا تو ساغر مجھے ریڈنگ روم کی چھت پر لے آتا اور غم حیات کا عنوان بن جاتا وہ پتھریلی نشستوں سے ٹیک لگا کر بیٹھ جاتا اس کے ہونٹ ہلنے لگتے اور خاموشی صورت گویائی میں ڈھلنے لگتی "اگر زندگی بے وطن کا گریباں بن جائے تو غم حیات کے ہاتھوں کو گریباں چاک کرنے سے کون روک سکتا ہے" اور جہاں تو ایک آئینہ خانہ ہے جس میں زندگی حیران وحشت شدہ کھڑی ہے" اس کی باتوں سے یوں لگتا تھا۔ جیسے زندگی کے سارے دُکھ اس کے شعور نے قبول کر لئے ہیں اور اس کی بصیرت کو غموں نے ڈس لیا ہے۔

اس کے اشعار میں سماجی المیوں کی گھمبیرتا اپنی گہرائیوں سمیت شعور سے براہ راست ہمکلام ہوتی تھی۔ اور وہ اس تجربے کو پوری شدتِ احساس سے بیان کر رہا تھا۔ جس نے اس کی زندگی کے سارے چلن کو تبدیل کر دیا تھا۔ ہمیں اس سے بڑی مسرت ہوتی کہ ساغر سے روزانہ ہی ریڈنگ روم میں ملاقات ہو جاتی ہے اور جب ہم ساغر سے ملاقاتوں کا نشہ ذہن میں لے کر چلے جاتے تو حمید موم بتی روشن کر کے منطق اور فلسفے کی کتابیں پڑھنے لگتا اور ساغر اپنے خیالوں کی گود میں سر رکھ دیتا۔

ساغر شہر اور ریڈنگ روم کے درمیان لٹو کی طرح گردش میں تھا۔ ہم دیکھ رہے تھے کہ ساغر نے اپنی ذات خود اختیاری مدہوشی کے حوالے کر دی تھی اور اپنے وجود سے بے نیازی نے اُسے ایک عجیب منزل پر لا کھڑا کیا تھا۔ جہاں وہ داخلی اور خارجی طور پر صرف شعور کے حوالے سے اپنے وجود کی گواہی بنا ہوا تھا۔ لیکن کبھی کبھی اپنے وجود کی نفی سے اتنا خوفزدہ ہو جاتا کہ چھوٹے سے چھوٹے واقع اسے زلزلے کی طرح ہلا کر رکھ دیتا اور کئی کئی دنوں تک کرب کی برچھیاں اُس کے احساس کو چھیدتی رہتیں۔

موسم تیزی سے بدل رہے تھے۔

ہم سب کا خیال تھا کہ اب ساغر ریڈنگ روم میں پھر کبھی نہیں آئے گا، لیکن دوسرے دن وہ پھر ریڈنگ روم میں مل گیا۔ میں نے کہا۔ ساغر صاحب یقین نہیں آتا کہ آپ موجود ہیں۔۔۔۔ ساغر نے کوئی جواب نہ دیا اور پوٹلی سے گولڈ فلیک کی ایک ڈبی نکال کر دیتے ہوئے بولا! "یہ تمہارے دوست اے حمید نے پکڑ دی ہے، انار کلی میں مل گیا تھا، اُس سے مل کر امرتسر یاد آ جاتا ہے" اُس وقت باغ میں کوئی خاص رونق

نہیں تھی اور ہم سب خشک گھاس پر بیٹھے ساغر کی باتیں سن رہے تھے۔

اُس روز وہ امرتسر سے پہلے انبالے، دہلی اور سہارن پور کے حوالے سے اپنے بارے میں بے ربط باتیں کر رہا تھا۔ اور شکنتلا کی باتیں کرتا کرتا رُک گیا ــــــ شکنتلا کا اس نے پہلے بھی ایک بار ذکر کیا تھا اور اس روز ہم سب ساغر کو کرید کرید کر مزا لینے کی کوشش کرتے رہے۔ میں نے محسوس کیا کہ ساغر شکنتلا کے ذکر سے شرما شرما جاتا تھا، اور اس کی آنکھیں چمک چمک اُٹھتی تھیں۔ پھر خود ہی بولا! ہاں ــــــ! ایک خیال کا عکس ہے، جو کبھی کبھی ذہن میں جھلمل کرنے لگتا ہے، اُسے کیا معلوم تھا کہ ہماری منزل کون سی ہے کہ ہم اپنی تلاش میں بہت دور نکل جائیں گے ــــــ شاید ہم چلتے رہتے لیکن دُکھ کے منظر پیچھا نہیں چھوڑتے۔

میری خواہش تھی کہ ساغر اور کچھ اپنے بارے میں بتائے، مدتوں بعد وہ ماضی میں بے اختیار جھانک رہا تھا۔ اعجاز اور احمد نثار نے میرا ساتھ دیا اور ساغر نے سگرٹ کا کش لگا کر کہا۔

"میری زندگی زنداں کی ایک کڑی ہے، میں نہ جانے کہاں پیدا ہوا تھا، ماں کی ممتا، باپ کی شفقت، بھائی کی محبت اور بہن کا پیار، یہ سب چیزیں میرے لیے علی بابا چالیس چور کے پُراسرار غار کی کہانی ہیں۔"

لیکن آپ نے کس شہر میں ہوش سنبھالا تھا ــــــ؟ احمد نثار نے پُوچھا۔ اور پیدائش کہاں ہوئی ــــــ؟

ساغر نے سگرٹ بجھا کر ہتھیلی میں رکھا اور پھر سوال گول کر کے پوٹلی میں

پڑی ہوئی چیزیں باہر نکال کر دیکھنے لگا۔ میں نے کہا ــــــ ساغر! تم نے نثار کے سوال کا جواب نہیں دیا ــــــ؟ ساغر نے اپنی نیم وا آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور پھر ریڈنگ روم کی طرف نظریں جما کر کہنے لگا۔ کہاں پیدا ہوا ــــــ؟ یاد کوئی مدد نہیں کرتی۔ ویسے گھٹنوں کے بل چلنے کا زمانہ سہارن پور اور انبالہ کی آغوشِ میں گزرا۔ اتنا کہہ کر ساغر پھر کہیں کھو گیا۔ اور کافی دیر بعد اعجاز نے پوچھا۔ پھر کیا ہوا ساغر صاحب! ــــــ "ہوں"، کہہ کر ساغر نے ــــــ میری طرف دیکھا اور کہنے لگا، "ماضی کے چہرے پر بھاری پردے پڑے ہوئے ہیں، ذرا سوچ لوں ــــــ! سوچنا کیا ہے، آپ انبالے اور سہارنپور کا ذکر کر رہے تھے، میری بات سُن کر ساغر نے پھر ہوں کی اور کہا،

"ہاں ــــــ یاد آگیا، ۱۹۳۶ء میں جب ذرا سُوجھ بوجھ کا زمانہ آیا تو ایک ویران مکان کی افسردہ دیواروں کے ساتھ لگے ہوئے لکڑی کے پرانے صندوقوں میں دیمک چاٹتی کتابوں کو سب سے پہلے دیکھا۔ شاید ان کے پڑھنے والے ۱۸۵۷ء کی گھٹاؤں میں گم ہو چکے تھے۔ وہاں رات کی تاریکی میں ایک ڈیوٹ پر روشنی پھیلانے کی جستجو کرتا ہوا ایک دیا میرے مشاہدے کی پہلی چیز تھی۔" ساغر کی بھویں سکڑتی جا رہی تھیں اور جلدی جلدی سگرٹ کے کش لگا رہا تھا۔ وہ خاموش ہو گیا تھا اور ہم اس خاموشی سے اکتا گئے تھے۔ اعجاز نے پھر بات آگے بڑھائی تو ساغر نے کہا ــــــ "سیّد زادے، یوں فقیر کو ماضی سے پردہ اٹھانے کی ترغیب دیتے ہو ــــــ سب ہوائی ہے ــــــ!" لیکن ہم نے ساغر کو مجبور کر دیا کہ وہ بات جاری

رکھے، اُس نے نیا سگرٹ سلگایا اور خشک گھاس پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا! ——— "اس گھر میں پہلے حاجی محمد حنیف اور حاجی محمد حسین نام کے دو بزرگ آباد تھے۔ ان کی پکی اور بیل بوٹوں والی قبروں کا کوئی پتھر شاید اب بھی وہاں کے قبرستان کے کسی کونے میں موجود ہو، میں نے اُردو اس گھر میں پچاس سالہ بزرگ حبیب حسن سے پڑھی یہیں مجھے شاعری کا شوق ہوا، میں نے بچپن بھی غربت میں گزارا، اس وقت کے تمام اُردو روزناموں کا مطالعہ میرا شغل تھا، پھر میں دس بارہ سال کی عمر میں اپنے اُستاد حبیب حسن کے ساتھ امرتسر آگیا۔ امرتسر میں جامعہ السنہ ہال بازار میں بہترین درسگاہ تھی جہاں طرحی مشاعرے ہوتے تھے اور میں ان میں جوش و خروش سے حصہ لیتا تھا ——— اعجاز نے اچانک سوال کیا

کیا آپ کوئی کام وغیرہ بھی کرتے ہیں۔

ہاں سیدزادے ——— اتنا کہہ کر ساغر کو زور سے کھانسی کا دورہ پڑا اور وہ کھانستے کھانستے بے حال ہوگیا۔ جب ذرا طبیعت بحال ہوئی تو اس نے خود کہنا شروع کر دیا ——— "۱۹۴۵ء میں کلیر کے مشہور عرس میں شریک ہوا، اُس وقت میں امرتسر کے ہال بازار میں شانہ سازی کا کام کرتا تھا اور امرتسر کے باہر کلیر شریف کا سفر میرا پہلا سفر تھا اس دوران شاعر دوستوں کے ساتھ میں نے کاشانہ ادب بہار نپور کی طرف سے ایک مشاعرے میں شرکت کی اور پھر دہلی پہنچا۔ دہلی دیکھی۔ دہلی والے دیکھے۔ جہاں مرقدِ غالب کی زیارت کی، شاعری کے اس مرشد کو اپنا اُستاد مانا۔ اور امرتسر پہنچ گیا۔ امرتسر میں دوسری جنگ عظیم کی باغی آزاد ہند فوج کے تین جرنیلوں کے استقبال کے لیے جلیانوالہ باغ میں ایک بہت بڑے جلسے میں نظم پڑھی ۱۹۴۷ء میں لاہور کی سرزمین پر قدم رکھا اور اب اپنے کے لیے بھی لاہور کو منتخب کر چکا ہوں۔ ساغر کہتے کہتے بہت تھک گیا تھا۔

آخر میں اس نے بڑی گہری افسردگی سے یہ شعر پڑھا۔

یہ حیات کی کہانی ہے فنا کا ایک ساغر
تو لبوں کو مسکرا کے اس جام سے لگا لے

شام ہونے والی تھی۔ درختوں پر بسیرا کرنے والے پرندوں کی ٹولیاں آنے لگی تھیں۔ ریڈنگ روم سے اخبار پڑھنے والے جا رہے تھے۔ ٹاہلی پر والٹریوں کی آوازیں گونجیں تو ٹاہلی کی طرف دیکھ کر بولا۔ "اف ان گھروں میں کب آتے تھے اور گھر تھے کہاں۔ یہ تو ان پروں والوں کا فیض ہے کہ انسان شام ہوتے ہی گھروں کی طرف چل پڑتے ہیں۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا کمبل اُٹھایا، کندھے پر رکھا اور خود کلامی کرتا ہوا جانے لگا تو میں نے پوچھا۔؟

ان دنوں کہاں بسیرا ہے۔

"سارا شہر میرا گھونسلہ ہے کیا باغ، کیا فٹ پاتھ، فقیر کے لیے تو گھر کا تصور بھی تشکیل بنا دیا گیا ہے تم بھی جاؤ شام ہو جائے گی۔"

ہم نے ساغر کو ریڈنگ روم سے نکل کر لوہاری کی طرف جاتے دیکھا اور تھوڑی دیر بعد سب باغ سے نکل کر اپنے اپنے راستوں پر چل دیئے۔

آؤ اِک سجدہ کریں عالمِ مدہوشی میں
لوگ کہتے ہیں کہ ساغر کو خدا یاد نہیں

ساغر کی خود اختیاری مدہوشی کے سامانوں میں تیزی سے اضافہ ہو رہا تھا۔ وہ سوتر منڈی سے رام گلی تک دن کے دو دو چکر لگانے لگا تھا۔ جہاں ساقی خانے تھے اور ان ساقی خانوں کے تجربوں کی بازگشت اس کے شعر میں پوری طرح سنائی دے رہی تھی۔

جسم کا زنداں روشن روشن
جب جی چاہا سوئی چبھو لی،

ساغر رام گلی کے ایک غار نما کمرے میں داخل ہوتا تو زندگی کے اندھیروں سے گھبرائے ہوئے لوگ جلتے چراغ کی روشنی میں ساغر کا چہرہ دیکھ کر کھل اٹھتے۔ اکھڑے ہوئے پلستر والی دیواروں، تاریک چھت اور دروازے پر پڑے ہوئے بھاری بوری کے پردے والے کمرے میں وہ لوگ ایک دوسرے کے لیے اجنبی تھے لیکن درد کے رشتے نے انہیں ایک بنا دیا ہوا تھا۔ زندگی کی بے معنویت کے اس مرکز میں جہاں بدن میں سوئیاں چبھوئی جاتی تھیں حواس کو سُن کر لیا جاتا تھا اور غربت، بے چارگی، بے دردی اور افلاس کے مارے ہوئے یہ لوگ شہر کے مختلف علاقوں سے یہاں آتے تھے اور یہاں سوئی چبھوتے ہی وہ زندگی کے دوزخ سے نکل کر خیال کی جنتوں میں داخل ہو جاتے تھے۔

ان کے جسموں پر چیتھڑے لٹکے ہوتے، وہ شہر سے اپنی بے چارگی کی قیمت مانگ کر سیدھا اس طرف آ جاتے اور یہاں سے نکل کر شہر کے ہجوم میں ذلت و رسوائی کا انعام پانے نکل آتے۔

میں کئی بار ساغر کے ساتھ رام گلی کے اس دوزخ میں گیا تھا اور ساغر اس طرف کا رُخ اس وقت کرتا جب اس کی مٹھی میں نئے نئے نوٹ ہوتے یا سگریٹ کی ڈبیاں اس کی جھولی میں ہوتیں اور کمرے میں قدم رکھتے ہی وہ ایک ایک چہرے کو غور سے تکتا اور سمجھ جاتا کس کس کو سوئی کی تمنا ہے۔ پھر مارفیا کے نشے کی لہروں سے اپنے ذہن کو روشن کر جانے لگتا۔ یوں دکھائی دیتا جیسے اس کے حواس پوری طرح بیدار ہو گئے ہوں۔

وہ راہ چلتے عجیب عجیب نکتے بیان کرنے لگتا۔ اس کے لبوں سے نکلنے والے لفظ نئی نئی معنویت آشکار کرنے لگتے اور کبھی کبھی وہ لوگوں کے سیلاب کو رک کر بڑے غور سے دیکھتا اور اپنے آپ سے باتیں کرتے ہوئے مجھ سے بھی مخاطب ہو جاتا۔

"دیکھو! ہستی نے ان کو کیا کیا فریب دیئے ہیں اور میں ان کو دیکھتا ہوں تو دیر و کعبہ کے خداؤں کے دامن سے لپٹ کر رونے کو دل چاہتا ہے۔ دیکھو یہ کس طرح بھاگ رہے ہیں جیسے ان سے روٹی چھین لی گئی ہو اور روٹی چھین لی جائے تو انسان کے پاس کچھ نہیں رہتا۔ یہ تدبیر اور تقدیر کے فاصلے بنتے میں اور بنتے بنتے مر جاتے ہیں۔"

ایک دفعہ ہم رام گلی سے باہر نکلے تو کراؤن بس کے اڈے پر ایک جنازہ جاتے ہوئے دیکھ کر ساغر ایک دم ٹھٹک گیا اور بولا یہ اس اُمید پر مر گیا ہے کہ یہ پھر جی اٹھے گا۔

اس روز وہ بہت خوش تھا۔ رات قیصر سرائے میں بسر کرنے کے لیے اس کے پاس پانچ روپے بچ گئے تھے۔ شاہ عالمی کے موڑ پر اس نے اچانک یہ فیصلہ بدل دیا اور رخصت ہو کر دوبارہ رام گلی کی طرف چلا گیا۔

ریڈنگ روم کا مرکز ٹوٹ چکا تھا۔ حیدر کی جگہ ایک دوسرا ملازم آگیا تھا اور وہاں کبھی کوئی نہیں آیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود ہم میں سے کوئی نہ کوئی جب اس شہر میں اکلاپے کا شکار ہو جاتا۔ ریڈنگ روم کی طرف آ نکلتا۔

اعجاز رضوی کا گھر قریب تھا اور میں اسے گھر سے بلا کر لاتا تو ہم غیر ارادی طور پر ریڈنگ روم کے باغ میں آ جاتے۔ کبھی ایسا بھی ہو جاتا کہ ادھر سے حنیف قندھاری آ نکلتا تو اچانک ساغر بھی کندھے پر کالی چادر ڈالے خاردار تاروں کے پاس آ کر رک جاتا۔ سردیوں کی ایک دوپہر ہم اسی طرح باغ مل گئے تو ساغر پوری طرح رنگ میں تھا۔ اس نے نرم نرم گھاس پر کمبل بچھایا اور پیروں کے بل بیٹھ کر اس نے کہنا شروع کر دیا۔

تم نے سنا شکیب جلالی نے خودکشی کر لی!

یہ خبر ہم پہلے بھی سُن چکے تھے اور سمجھ نہیں آتی تھی کہ اتنا باشعور شاعر خودکشی کا فیصلہ کرنے پر کیوں مجبور ہو گیا۔ وہ بھی ہمارے ساتھ اس شہر میں کھنچے ہوئے چہرے کے ساتھ نظر آیا کرتا تھا۔ شکیب جلالی کی خودکشی کا موضوع اتنا بکھر گیا کہ سگرٹوں کا دھواں اڑاتے اڑاتے شام ہونے لگی۔

ساغر نے باغ کے ساتھ بہتی بدرو کے کنارے ٹاہلی کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ ٹاہلی کبھی کبھی مجھے پوری نظم دکھائی دیتی ہے۔"

ساغر سے اعجاز نے فرمائش کی۔ کوئی تازہ کلام لکھا ہو تو سنائیں۔ ساغر نے اپنے کمبل پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "اس زود شنیوں کے شہر میں جہاں لوگوں کو اندھیرے نگل رہے ہوں۔ اس سے بڑا تازہ کلام اور کیا ہو سکتا ہے۔ میں اس جیتے جاگتے شہر کے بارونق بازاروں سے گزرتا ہوں تو یوں لگتا ہے جیسے ان

جنازے میں شریک ہوں۔

ساغر کی آواز بھاری ہوتی جا رہی تھی۔

"ایک جیسی صبح ایک جیسی شام، زندگی کا یہ روپ بھی کتنا المناک ہے۔ فقیر کا سفر بڑا لمبا ہے۔" "آپ کس سفر کی بات کرتے ہیں۔ کیا یہ زندگی نہیں جو حرکت کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔" میں نے پوچھا۔

"ہاں! فقیر زمین کی گردش کی گونج بھی سن سکتا ہے۔" ساغر نے گردن اٹھا کر کہا اور پھر اپنے بائیں جانب سڑک پر سے گزرتی ہوئی ایک نئی نویلی دلہن کو دیکھ کر بولا۔

"یہ بھی زندگی کا ایک بول ہے جو لبوں سے نکل کر غائب ہو جاتا ہے۔" اعجاز جوان دنوں ایک خبر رساں ادارے سے منسلک ہو گیا تھا۔ اس نے ساغر سے کہا

ساغر صاحب! اگر آپ امریکہ میں پیدا ہوتے تو آپ کی کیا سوچ ہوتی؟

"بھئی میں کیوں وہاں پیدا ہوتا۔ جبکہ میں پیدا ہی یہاں ہوا ہوں۔" ساغر نے قدرے مسکرا کر کہا اور اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ فقیر نے پیدائش کے عمل پر بہت غور کیا ہے لیکن یہاں جب سارے دستور اور فرمان گونگے ہیں تو انسان بول کیسے سکتا ہے۔ میں موسموں کو بدلنے کے عمل سے سمجھ گیا ہوں کہ انسان سفر پر ہے۔ پرانے دائرے میں مقید کر دیا گیا ہے۔ جب تک دائرے نہیں ٹوٹتے انسان دائرے میں دائرہ ہو کر رہے گا۔" "لیکن یہ دائرے کیسے ٹوٹیں گے؟" اعجاز نے پوچھا۔

"ٹوٹ جائیں گے، تبدیلی فطرت کے باطن میں ہے، جو آج ہے وہ کل نہیں تھا سو جو کل تھا وہ آج نہیں۔ تدبیر تقدیر کا لباس تار تار کر کے رہے گی۔ سکوت ٹوٹے گا اور انسان اپنے اندر ضرور بیدار ہو گا اور جب بیدار ہو گا تو جنت اس دنیا پر لیا ئے گا۔"

کانٹے جو لگیں ہاتھ تو کچھ غم نہیں ساغرؔ
کلیوں کو ہر اک گام پہ بکھرا کے گزر جا

میری یادوں کے سمندر میں اَن گنت بھنور ایسے بھی ہیں جو مجھے ساغر کی گردشوں سے نکال کر کہیں سے کہیں لے گئے۔ لیکن میں اپنے سفر کے ہر سنگِ میل پر "ساغر بدست" ہی رہا۔ وہ ایک مستقل غم تھا۔ جو میرے ساتھ ساتھ تھا اور ایوب خان کے زوال کے آخری دور میں ایک دن جب میں کیمپ جیل میں گھوم رہا تھا تو مجھے ساغر بہت یاد آیا۔ جس نے کیمپ جیل میں تین ماہ گزارنے کے بعد بھی بلال گنج اور ملتان روڈ پر کیمپ جیل ایسے کمروں میں طویل عرصہ گزارا تھا۔

زندگی کے بیتے ہوئے سالوں میں اَن گنت تبدیلیاں رُونما ہوئیں آہ و فغاں کے مقامات تیزی سے تبدیل ہوتے رہے اور میں بیتے ہوئے دنوں کو یاد کرتا ہوں تو اُن مناظر کا سلسلہ دور دور تک پھیل جاتا ہے جن کے بعض فریموں میں ساغر کا وجود مسلسل گھلتا ہوا نظر آتا ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوا کہ حالات کے جبر نے مجھے ان مناظر سے کاٹ کر رکھ دیا اور کبھی ان مناظر کا حصہ بنا دیا۔

میرے لئے ان مناظر کو ترتیب دینا مشکل ہے جن میں شکستِ ساغر کا عمل تیزی سے جاری تھا۔ لیکن اس کی شخصیت اور کردار کی جھلکیوں سے ایک ایسا

منفرد وجود مرتب ہوتا نظر آتا ہے جو خیال کی سچائی کا مظہر بن جاتا ہے۔

وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ اور ایک مقام سے دوسرے مقام تک تیزی سے منتقل ہوتا رہا، لیکن کسی بھی لمحہ وہ ایک صداقت پرست شاعر کے روپ سے محروم نہ ہوا۔

مجھے یاد ہے میں نے شکستِ ساغر کا آغاز ریڈنگ روم سے کیا۔ جہاں سے نصیر حیدر نے مستقل تبادلہ کروا لیا تھا لیکن جب بھی میری زندگی میں کوئی گم سُم موڑ آتا تو میں دوبارہ ریڈنگ روم کی طرف نکل جاتا تھا۔

اس وقت بھی میں گول چھتوں والے ریڈنگ روم میں ہوں، یوں لگتا ہے جیسے میں علاؤ الدین (فلم سٹار) سے مل کر آیا ہوں اور ساغر کو پارک لگژری ہوٹل میں ہونے والی فلم فیڈریشن کی تقریب کا مہمانِ خصوصی کا دعوت نامہ دینے آیا ہوں۔

لیکن ریڈنگ روم بھی اچانک میری یادوں سے نکل گیا ہے اور میری نگاہیں اُسے لوہاری کے آس پاس تلاش کر رہی ہیں اور وہ مجھے مسلم مسجد کے مینار کے نیچے سیاہ چادر اوڑھے نظر آیا ہے۔ اور اس کی مٹھی میں سنے نوٹ ہیں۔

ساغر کے نزدیک روپے کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ اس کے پاس جتنے پیسے ہوتے رات کو خرچ کر کے سوتا اور صبح کے بارے میں اس کا یہ فقرہ مجھے نہیں بھول سکتا کہ۔

صبح کی پہلی کرن کے ساتھ ہی جو ضمیر کا تنازعہ شروع ہو جاتا ہے۔ اس کی لذت شراب کی گہری ہے۔

ساغر کے پاس پیسے آ جاتے تو وہ ایک ہی دن میں خرچ کر دیتا پہلے سے سوچی ہوئی چیزیں خرید لیتا۔ اسے سگریٹ پینے کے علاوہ اچھے قلم سے لکھنے کا بہت شوق تھا اس نے کئی بار گھڑی خریدی اور دوسری چیزوں کے علاوہ گھڑی بھی کچھ عرصہ بعد بک جاتی۔ پھر سرکلر روڈ کے اس حصے سے غائب ہو جاتا اور سرکلر روڈ والوں کے پاس اس کی یادیں رہ جاتیں۔

تین چار دن بعد وہ مجھے دربار کی کے باہر ہسپتال روڈ کے موڑ پہ بیٹھا مل گیا۔ اور ادبی کٹیا بنانے کے منصوبے کی تفصیلات بتانے لگا۔

ادبی کٹیا کا منصوبہ کوئی نیا منصوبہ نہیں تھا لیکن اس کا مکمل ہونا مشکل تھا ویسے ایک ایک کمرے کو کرایہ پر لینے کا بہت آرزو مند تھا جہاں وہ مکمل خود مختار بن کے ساتھ رہ سکے۔ اس نے کئی بار کمرہ کرائے پر بھی لیا لیکن دوسرے مہینے اپنا سامان تک وہاں چھوڑ کر فٹ پاتھ پر آگیا۔ ادبی کٹیا کی تفصیلات طے ہونے لگیں کہ اس کا دروازہ کبھی بند نہیں ہوگا اور اس کے اوپر سرخ پرچم لگائیں گے۔ ایک طرف فقیر کا بستر ہوگا۔ کچھ کھانا پکانے کا سامان ہوگا اور بزم سخن سجائیں گے۔

اس کے پاس کہیں سے ڈھیر سارے پیسے آجاتے تو وہ انگیٹھی کیتلی، گلاس، دری اور اسی قسم کا دوسرا سامان خرید لیتا۔ چند دن تک اخبار مارکیٹ یا پاک ٹی ہاؤس میں یہ سامان پڑا رہتا۔ ایک دو مرتبہ کھانا بھی اپنے ہاتھ سے پکاتا۔ خود تو بہت کم کھایا کرتا تھا البتہ کھانے کی محفلیں اکثر منعقد کرتا۔ اگر چند دنوں تک کسی جگہ قیام کر لیتا تو وہاں شام کو آنے کی دعوت سب کو دیتا اور خود ہمیشہ دیر سے پہنچتا۔ اتنی دیر میں وہاں ہجوم جمع ہو چکا ہوتا۔ اسے دور دور سے لوگ ملنے کے لیے آتے اور وہ ان میں ایک دانا انسان کی طرح بیٹھا باتیں کر رہا ہوتا۔

ساغر اپنی درویشانہ ڈگر پر بڑے مزے سے چل رہا تھا۔ لیکن معاشرہ جس ظالمانہ نظام کے چنگل میں گرفتار تھا، اس کے اثرات اس کی فقیرانہ زندگی پر بھی بڑے گہرے تھے۔ وہ کسی شے سے بے خبر نہیں تھا۔ لوگوں کی باتیں سنتا اور ان کے رہن سہن اور اخلاقی اعتبارات کا ماہرانہ تجزیہ کرتا تھا۔

اس کی مست الست حالت اس لیے ترتیب پا چکی تھی کہ اس کی مدہوشی ہی اس کی بیداری بن گئی تھی۔ اس زندگی میں وہ سارے نشے ہوش کھو کر جھیل گزر رہا تھا اور دنیا جس کو ہوش سمجھ کر ہوشمندی کا ثبوت دے رہی تھی اس کے نزدیک ایک بہت بڑی بے ہوشی تھی۔ وہ دنیا کے کسی بھی ہونے والے واقعہ سے بے خبر نہ تھا

مجذوب تھی تو ساغر کا مقدر رہتی، لیکن بعض اوقات اسے اس شہر میں روزانہ کی ضروریات پوری کرنے کے لیے بھی بڑی ذہنی اذیت برداشت کرنا پڑتی تھی اور قیصر سرائے کا روزانہ کرایہ ادا کیے بغیر وہ روشنی اور ہوا سے محروم کمرے میں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ شہر میں سینکڑوں لوگ ایسے تھے جو ساغر کو اپنی حیثیت کے مطابق کچھ نقدی نذر کرتے تھے جن کے لیے وہ اکثر ممنونیت کا پرجوش اظہار کیا کرتا تھا۔ وہ کسی سے کچھ لیتا تو سب سے پہلے چومتا پھر اپنے مخصوص انداز میں اللہ حمد کرنے کہہ کر جھومنے لگتا اور فوراً ہی چلا جاتا

کچھ عرصہ بعد وہ شاہ عالمی کے باغ میں خلیفہ کے ہاں چلا گیا۔

میں نے خلیفہ نکے سے کہہ دیا تھا کہ اسے ٹوکا نہ کرے اور شاید یہی وجہ تھی کہ باغ میں اس نے ایک طویل عرصہ قیام کیا۔ رات کو بارش ہو جاتی تو اٹھ کر کوٹھڑی میں آ جاتا تو کالو بھی اس کے ساتھ ہوتا۔ ساغر نے گرمیاں باغ میں گزاریں

جب سرد ہوائیں چلنے لگیں اور لٹھے کی بوسیدہ سیاہ چادر سردی سے اس کے جسم کی حفاظت کرنے میں ناکام ہو گئی تو ساغر باغ ہی چھوڑ کر چلا گیا۔ ایک شام میں باغ میں ساغر سے ملنے گیا تو خلیفہ نکا بڑا پریشان بیٹھا تھا۔ اس نے دور

ہی سے کہا۔

"سرکار تو چلے گئے۔ میں تین دن سے انتظار کر رہا ہوں اور ان کا بستر اٹھا کر میں نے کوٹھڑی میں بھی رکھ دیا کہ اب باہر سونے کا موسم نہیں رہا۔ لیکن سرکار تو ایسے غائب ہوئے جیسے باغ میں کبھی آتے ہی نہ تھے۔ اچھا سرکار کی مرضی۔"

اعظم مارکیٹ میں بھی اس کے دو تین دکاندار بڑے مداح تھے انارکلی کا ہر دکاندار اسے اچھے طرح پہچانتا تھا اور وہ سارا دن شہر کا سفر کر کے لوہاری دروازے سے پہنچ جاتا۔ یہ ساغر کی روحانی اور ذہنی بیداری کا بے مثال دور تھا اور وہ ہر لمحہ حرکت پذیر نظر آتا تھا۔ اس کی زندگی سراپا جد وجہد بن گئی تھی۔ وہ روزانہ تخلیق کرتا تھا۔ ہر موضوع پر اس کا ذہن منظم شعروں کے پھول کھلاتا تھا اور اس کی تخلیقات ایک روشنی کی طرح پھیلتی رہتیں ان تمام باتوں کے باوجود وہ طمع حرص اور خوف سے قطعاً آزاد تھا۔ اسے صرف ایک دن کی ضروریات درکار ہوتیں جنہیں کبھی وہ شعر بیچ کر یا کبھی "حسن طلب سے پوری کر لیا کرتا تھا۔

وہ اخبار مارکیٹ میں رہے یا نہ رہے اخبار مارکیٹ والے اسے اپنے کسی نہ کسی جلسے پر کھینچ ہی لاتے۔ ایک مرتبہ اس نے جلسے میں اخبار فروش کے عنوان سے نظم پڑھی تو حاضرین نے جیبوں سے نوٹ نکال کر لہرا دیئے۔ کسی کے ہاتھ میں ایک روپے کا اور کسی کے ہاتھ میں دس کا۔ ساغر نظم پڑھ کر سٹیج سے اترا تو اس نے جلدی جلدی پانچ سات مداحوں سے نوٹ وصول کیے اور باقی کو چھوڑ یہ کہتا ہوا باہر نکل گیا "بس اب فقیر کا دامن بھر گیا ہے۔"

اپنے مجبور تقدس کے سہارے ساغر
دیر و کعبہ کے خداؤں سے لپٹ کر رو لوں

فکرِ ساغر کے خریدار نہ بھولیں گے کبھی!
میں نے اشکوں کے گہر تھے جو بنائے پتھر

سردیاں شروع ہو چکی تھیں۔ ساغر شب بسری کے پرانے مسئلے سے دوچار تھا۔ گیلانی پریس کے حکیم شاہ سے ناراضگی کے باعث اس نے گیلانی پریس کے آسیب زدہ کمرے کے کھلے دروازوں کو بھی اپنے لیے بند کر لیا تھا اخبار مارکیٹ میں تجارتی توسیع نے ساغر کے بستر کی گنجائش ختم کر دی تھی اور

ساغر اس شہر میں کوئی پتہ نہیں تھا۔ اس نے کبھی کسی کو خط نہیں لکھا تھا اور نہ ہی اس کے نام کبھی کوئی خط آیا تھا۔ وہ کسی تحریر پر اپنے نام کے ساتھ صرف لاہور کا لفظ لکھا کرتا تھا۔ دوسرے شہروں سے بھی بہت کم شاعروں کے دعوت نامے اس کے نام آتے تھے۔ اسے تلاش کرنے والے اکثر ناکام ہو جاتے

وانار کلی میں بیٹھتے۔ ہوٹل کے ساتھ والے ورزی خانے کا شاید راستہ بھول گیا تھا س لیے لوہاری دروازے سے سردیاں آتے ہی غائب ہو گیا۔ شام کو داتا بازار کی طرف جاتے ہوئے میری نگاہیں ساغر کو ضرور تلاش کرتیں۔ کیونکہ داتا صاحب کے مزار کے جنوبی دروازے کے سامنے پانی کی سبیل تھی اور اس سبیل کے پیچھے تنگ گلی میں جوتے بنانے والوں کے کارخانے میں بھی اس کا آنا جانا تھا۔ میں نے ایک دو مرتبہ وہاں سے پوچھا بھی لیکن ساغر کا کوئی پتہ نہ چلا۔

بہت دنوں بعد ساغر نے لوہاری دروازے میں آنا شروع کر دیا اس سے کوئی بات کی جاتی تو وہ صرف ہوں ہاں کر کے چُپ ہو جاتا۔ سرِشام پاک لینڈ پریس میں آ جاتا۔ شرفو جینک ساز اس کے لیے چٹائی بچھا دیتا۔ ساغر اگر بتیاں جلا کر بیٹھ جاتا تو کسی سے بات تک نہ کرتا۔ اس کی زنبیل مستقل طور پر پاک لینڈ پریس کے گیٹ کے پیچھے لٹکنے لگی۔ اس کے پاس بیٹھنے والے ادھر ادھر کی مارتے رہتے اور وہ کبھی کبھی ان کی طرف دیکھتا — لب ہلا کر منہ ایک طرف کر لیتا۔ بہت دنوں بعد اس نے پاک لینڈ میں قدم رکھتے ہی شرفو کے پاس بیٹھے ہوئے مجھے دیکھ کر کہا۔

"کہو حضرت! بہت دنوں بعد نظر آئے ہو۔" حالانکہ میں اسے روزانہ پاک لینڈ پریس میں ملنے آتا تھا۔ اس نے چٹائی پر بیٹھنے سے پہلے سگریٹ کی ڈبیا میری طرف پھینکی اور خود اپنا کمبل پھینک کر باہر چلا گیا۔ شرفو نے کہا۔

"بابا آج بولا ہے۔"

ساغر سڑک پار کر کے واپس آیا تو آتے ہی پوچھنے لگا۔

"سناؤ کیا حال ہے تمہارے بھٹو کا۔ اب تو وہ بادشاہ بن گیا ہے۔"

اسے کہو ریڈیو سے فقیر کی رائلٹی دلوا دے۔"

اُن دنوں میں ریڈیو میں تھا اور مجھے دیکھتے ہی ساغر کو اپنی رائلٹی یاد آ جاتی تھی۔ ریڈیو سے اُس کی نعتوں اور غزلوں کے ریکارڈ روزانہ نشر ہوتے تھے لیکن اسے زندگی میں صرف ایک بار ریڈیو سے رائلٹی ملی۔ میں ریڈیو میں ایک بے اختیار کارکن تھا اپنے طور پر ساغر کے لیے کوئی پروگرام نہیں بنا سکتا تھا اس لیے چُپ رہتا۔ پاک لینڈ پریس کے فٹ پاتھ پر ساغر نے محفل آرائی شروع کر دی۔ رات بھی وہاں بسر کرتا اور صبح ہی صبح وہاں سے نکل جاتا۔ کبھی کبھی دوپہر کو بھی ادھر آ نکلتا لیکن جب تک اس کا خرچہ پورا نہ ہوتا لوہاری کا رخ نہ کرتا۔

میرا ٹی وی میں آنا شروع ہوا تو پروڈیوسر یعقوب ناسک نے میرے مشورے سے ساغر پر ایک دستاویزی فلم بنانے کا منصوبہ بنا لیا۔ ایک شام یعقوب ناسک میرے ساتھ اسے ملنے کے لیے آیا تو وہ پاک لینڈ پریس سے شاہ عالمی کی چوبرجی مینشن کی چھٹی منزل کے ایک کمرے میں منتقل ہو چکا تھا۔

یہاں کوئی بٹ صاحب طلائی سہرے بنانے کا کاروبار کرتے تھے اور ساغر کے معتقد تھے۔ میں اور یعقوب ناسک اوپر کمرے میں گئے تو ساغر موجود نہیں تھا۔ بہرحال بٹ صاحب نے ہمیں یہ کہہ کر بٹھایا کہ داتا دربار کی طرف گئے ہیں۔ آتے ہی ہوں گے۔ ساغر کے آنے سے پہلے وہاں پانچ چھ آدمی اور اسے ملنے کے لیے آ گئے۔ تھوڑی دیر بعد ساغر کی آواز آئی وہ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"کبھی اتنی پستی اور کبھی یہ بلندی کہ چڑھتے چڑھتے دم دے دیں۔ واہ سبحان اللہ۔"

ساغر اوپر آیا تو ہانپ رہا تھا۔ اس کے حواس درست ہوئے تو میں نے ناسک کا تعارف کرایا کہ ٹی وی سے آئے ہیں۔ ساغر بڑے تپاک سے ملا اور ہم کافی دیر تک ساغر کے پاس بیٹھے رہے۔ یعقوب ناسک نے دوسرے دن مجھے سکرپٹ لکھنے کے لیے کہا اور خود ہیڈ کوارٹر کے لیے منصوبہ بنانے لگا۔ ایک ہفتے بعد ہیڈ کوارٹر سے ساغر کی زندگی پر دستاویزی فلم بنانے کے لیے منظوری تو آگئی لیکن لاہور سنٹر سے کوئی کیمرہ نہ مل سکا۔ عذر یہ پیش کیا گیا کہ ان حالات میں کوئی کیمرہ اس کام کے لیے مخصوص نہیں کیا جا سکتا۔ یعقوب ناسک کو بڑی مایوسی ہوئی اور میں نے سکرپٹ اور تصویروں کے نیگیٹو لفافے میں بند کر کے اپنے ناکام سکرپٹوں والے ڈبے میں رکھ دیئے۔

ریڈیو میں اے حمید صاحب پنجابی پروگرام "سوچاں" پیش کرنے لگے تو انہوں نے ساغر پر ایک خاص پروگرام ترتیب دیا۔ ان کا خیال تھا کہ اس طرح ساغر کو ساٹھ روپے بھی مل جائیں گے اور ساغر کی آواز بھی محفوظ ہو جائے گی۔ [illegible] نہ تو ریڈیو والوں نے اسے کبھی بلایا تھا اور نہ ہی خود اس نے وہاں جانا مناسب سمجھا تھا۔ میں نے ساغر سے چار نعتیں لیں اور میوزک سیکشن کے انچارج باسط صاحب کو دیں۔ وہ ساغر کے پہلے ہی بڑے مداح تھے انہوں نے فوراً تیس تیس روپے کے حساب سے خریدنے کے لیے ریڈر رپورٹ لکھی اور پروگرام منیجر کے پاس بھیج دی۔ خود خواجہ عمر مرحوم نے بھی ساغر کا نام دیکھتے ہی دستخط کر دیئے۔ اب ایک سو بیس روپے کا چیک وصول کرنا ساغر کے لیے بہت بڑا مسئلہ بن گیا۔ چیک بنا پڑا تھا، لیکن ساغر ریڈیو سٹیشن کی طرف جانے کے لیے پاک لینڈ پریس سے نکلتا تو کہیں اور چلا جاتا۔ آخر شرفو بے چارہ

کام آیا اور اسے صبح ہی صبح رکشہ میں بٹھا کر ریڈیو سٹیشن میں لے گیا۔ شام کو شرفو نے بتایا کہ "ابھی ابھی مرشد گئے ہیں۔ ایک سو بیس میں سے صرف پچیس روپے رہ گئے ہیں۔ ویسے بڑے خوش ہیں، کہتے تھے ریڈیو کے لیے اب بہت لکھیں گے۔"

پاک لینڈ پریس کے فٹ پاتھ پر ساغر کی محفلیں عروج پر تھیں کہ وہ چوک داتا صاحب میں آ گیا۔ ملک تھیٹر کے پاس ایک بند دکان کے تھڑے کے نیچے کچھ خالی جگہ تھی دونوں طرف دو ہوٹل تھے۔ سامنے بازار تھا اور اس فٹ پاتھ پر ساغر کا قیام بڑا طویل تھا۔

شام کو اس جگہ آ کر ساغر اپنا کمبل بچھاتا۔ پیچھے رکھی ہوئی دو اینٹیں لا کر درمیان میں رکھ دیتا۔ ان پر موم بتیاں روشن کرتا۔ اگر بتیاں سلگاتا اور اگر بتیوں کی خوشبو ساغر کی آمد کا پیغام بن کر پھیل جاتی اور اس کے گرد ہجوم جمع ہو جاتا۔ نوجوان شاعروں کی ٹولی ہر شام وہاں آتی تھی۔ ادھر ادھر ہوٹلوں میں گانوں کے ریکارڈ بج رہے ہوتے اور ادھر ساغر کی محفل میں شعر و نغمہ کے دور چل رہے ہوتے۔ میں رات کو گھر جاتے ہوئے ساغر کے پاس ضرور ٹھہرتا تھا۔ جمعرات کو فٹ پاتھ پر باقاعدہ مشاعرہ ہوتا۔ مشاعرے کے بعد چائے کا دور چلتا اور ساغر کی محفل برخاست ہو جاتی۔

کوئی حقیر سی شے ڈال میرے ساغر میں
کہ زندگی کو برائے عوام کرنا ہے

نوبہار ہوٹل کے طیفو نے مجھے بتایا کہ ایک دوپہر ساغر بابا آیا تو اس کے پاس پانچسو روپے کے نوٹ تھے اور کہہ رہا تھا۔

"اب کے ریشم کا بستر بنواؤں گا۔"

ساغر نے چائے پی سگریٹ منگوائے اور بستر لینے چلا گیا مگر تھوڑی دیر بعد پھر واپس آگیا۔ طیفو نے پوچھا۔

"بابا تم تو بستر لینے گئے تھے۔"

"لے لیا ہے طیفو۔" ساغر نے جواب میں کہا۔

"مگر بستر ہے کہاں؟" طیفو نے حیرت سے پوچھا" اور باقی روپے کہاں ہیں؟"

ساغر نے اسے سڑک کے پار بجری پر لیٹے ہوئے کسی ننگے شخص کو دکھا کر کہا "اس کو دیکھ کر بستر کا خیال ترک کر دیا اور سارے روپے اسے دے دیئے ہیں۔"

آخری دنوں میں اس پر فالج کا حملہ ہوا وہ مرنے سے تو بچ گیا لیکن فالج اسے ہلا کر رکھ گیا۔ وہ کہا کرتا تھا شکر ہے کہ ذہن بچ گیا ہے۔"

فالج اس کی سالہا سال کی اپنی ذات کی عدم حفاظت کا نتیجہ تھا۔ نرم بستر پر آنے والی نیند کے تصور تک سے آشنا نہ تھا۔ اس کا کوئی گھر ہوتا تو شاید اپنے لئے بستر ضرور بنا لیتا۔ ویسے تو مہینے ایک ہی ملبوس میں گزر جاتے

اور ایسا بھی ہوتا کہ وہ کسی حمام میں جا کر خوب نہاتا، شیو کراتا اور جڑے ہوئے بالوں کو کئی دنوں تک کھولتا رہتا لیکن یہ عمل سال میں ایک دو مرتبہ کرتا۔ میں نے اسے کبھی پیٹ بھر روٹی کھاتے نہیں دیکھا۔ اچھی سے اچھی چیز کے ایک دو نوالے کھا کر مطمئن ہو جاتا۔ راہ چلتے اگر موسم کا پھل اسے نظر آجاتا تو ایک آدھ دانہ ضرور خرید لیتا اور اسے بھی تنہا نہ کھاتا۔ فالج کا حملہ اس نے صرف اپنی قوتِ ارادی سے پسپا کیا اور اس حملے میں اس کا دایاں ہاتھ ہمیشہ کے لیے سُن ہو گیا اس سے وہ بہت فکر مند ہونے لگا تھا کہ وہ لکھے گا کیسے۔ ہسپتال میں جانے کا قائل نہیں تھا اور اسے یقین تھا کہ اس کا ہاتھ محض پیتھوڈرین اور ہیروئین کی جعلی گولیوں کی وجہ سے بیکار ہوا ہے جو دکاندار زیادہ سے زیادہ پیسے کمانے کی وجہ سے لوگوں کے پاس فروخت کرتے تھے۔ فالج کے حملے اور اس کے ہاتھ کے بیکار ہونے کی خبر میں نے مساوات میں اعجاز رضوی کر دی تھی۔ یہ خبر شائع ہوئی تو عقیدتمندوں نے پھر سات سو روپے کے قریب اس کے لیے احمد ندیم قاسمی کے پاس جمع کرا دیئے۔ یہ سات سو روپے بھی اسے قسطوں میں ملے لیکن وہ پھر تازہ دم ہو گیا۔ بہت دنوں بعد پاک لینڈ پریس کے پھاٹک پہ آیا تو اس نے چمکتی ہوئی سفید زنجیر کلائی کے گرد لپٹی ہوئی تھی۔ صاف ستھرا چہرہ اور سرمہ لگی آنکھیں۔ وہ جذبے کی بےداغ تازگی کے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔ مفلوج ہاتھ پہ اس نے سرخ رومال باندھا ہوا تھا تمام جاننے والے شاہ جی کے دفتری خانے کے برآمدے میں اس کے گرد بیٹھے تھے اور وہ دوستوں سے مخاطب تھا کہ اب اس نے زادِ راہ جمع کر لیا ہے پیسے مل گئے تھے۔ میں نے چار پیرہن بنا لیے ہیں۔ پیتل کا موتیوں والا کشکول خرید لیا ہے

اور تم آ ذ نا مہرے والوں کے ہاں ان دنوں وہاں بستر لگا ہوا ہے۔ شعر وہاں بھی سنائیں گے۔ خیر ہو بھلا ہو۔

وہ مفلوج ہاتھ سے کاغذ پر ٹیڑھے میڑھے حروف لکھ رہا ہوتا تو میرا دل لرز اٹھتا اور یہ سوچ سوچ کر میرا دماغ پھٹنے لگتا کہ یہ کیسا معاشرہ ہے کہ اس کا ایک عظیم فرد علاج بھی نہیں کروا سکتا۔ ساغر کو اپنے دائیں ہاتھ کے مفلوج ہونے کا بڑا دکھ تھا۔ وہ درد بھرے لہجے میں کہتا۔

ہاتھ کو بیکاری ہونا تھا تو بایاں ہو جاتا۔

میں نے قدرت اللہ شہاب کو ساغر کے بارے میں خط لکھا۔ انہوں نے ساغر کے حالات پر ہمدردی کا اظہار بھی کیا! لیکن میری خواہش کے مطابق ساغر کا تاحیات وظیفہ نہ لگ سکا۔ دل نے بہت چاہا کہ گورنر نیازی کو لکھوں لیکن اس خیال سے نہ لکھ سکا کہ ممکن ہے کہ خط ہی نہ پہنچ سکے اور اگر کچھ بھی نہ ہوا تو دل کو اور ملال ہوگا۔ میں نے ساغر کو شہاب صاحب کے خط کے بارے میں بتایا تو اس نے کہا۔

" فقیر کی زندگی پر تبصرہ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ فقیر کا معاملہ کچھ اور ہے۔

نہ سجدے نہ سجدوں کی تعبیر ساغر
جبینِ شہادت لہو رو رہی ہے

"میں نے زادِ راہ جمع کرنا شروع کر دیا ہے" ساغر کا یہ مقطع ریڈیو سٹیشن کی عمارت میں مجھے طالب چشتی نے بھی سنایا تھا۔ اور حمید سے میں نے بات کی تو وہ بھی وسوسوں کا شکار ہو گیا۔ ایک تو ساغر کی صحت اتنی گر چکی تھی کہ سگریٹ پیتے ہوئے اسے زبردست کھانسی ہونے لگتی تھی اور اس کی آنکھیں باہر کی طرف اُبل پڑتی تھیں۔

میں شام سے پہلے لوہاری دروازے کی طرف جا رہا ہوتا تو ایک بے نام سا خوف مجھ پر طاری ہوتا۔ لوگوں کے بے خبر ہجوم میں میری نگاہیں اس کو دیکھنے کے لیے بے چین ہوتیں۔ کوئی نہ کوئی مجھے ایسا آشنا مل جاتا اور مجھے ساغر کے بارے میں معلوم ہو جاتا کہ اس وقت وہ کہاں ہوگا۔

پاک مینڈ پریس کی ڈیوڑھی کے باہر سکول کے بچوں کے تھیلے بنانے والا شاہ قدر کاشمیری اور شرفو عینک ساز اس کی آمد و رفت کی پوری ڈائری رکھتے تھے لیکن وہ ساغر کی بعض عجیب و غریب باتوں سے بڑے فکر مند تھے۔

قدر کاشمیری نے بتایا کہ وہ صبح ہی صبح (ادھر) نکلتے ہیں اور کہتے ہیں ان دنوں موت مجھ سے گفتگو کرتی رہتی ہے۔ میں اسے اپنے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے دیکھتا ہوں اور میری میت خاموشی سے دفن کی جائے گی۔

میں اس سے ملنا چاہتا تھا لیکن حالات کے مصروفوں نے ملاقات کی ساری

راہیں توڑ دی تھیں۔ ریڈیو سٹیشن کی مصروفیت اور ریڈیو کے بعد فاروق عادل اور راحت سخی سے دوستی نے قدم قدم پر رکاوٹیں کھڑی کر دی تھیں ۔ فاروق عادل اور راحت سخی بھی جبرِ مسلسل تھے۔ ان کا بھی میری ذات پر قبضہ تھا۔ عادل ایک بار پھر انگلستان سے آگیا تھا اور اس کے نیک دل بھائیوں نے اسے پھر کار دے دی تھی۔ راحت سخی جلدی جلدی ایک مشہور فنکارہ اور ادیبہ بننا چاہتی تھی۔ اس کی بھی بڑی پرابلم تھیں اور وہ مجھے اکثر ریڈیو سٹیشن سے یرغمالی بنا کر ہوٹلوں میں لے جاتی یا لارنس میں بیٹھ کر اپنے لکھے ہوئے مضمون اور افسانے سنانے لگتی ۔

میں ان سے فارغ ہو کر لوہاری کی طرف آتا تو وہاں ناظم کی دکان پر چوہدری صدیق اور نجمی مل جاتے۔

رات ہو جاتی تو میں رکشہ میں ساندے کی طرف روانہ ہو جاتا۔ ایک دن جب ذوالفقار علی بھٹو وزیر اعظم کی حیثیت سے گورنر ہاؤس میں ٹھہرے ہوئے تھے اور ریڈیو سٹیشن میں بڑی غیر معمولی سرگرمیاں شروع ہو گئی تھیں میں گورنر ہاؤس میں ان کی ایک دن کی پہلے کی تقریر کا پنجابی ترجمہ کر رہا تھا کہ راحت سخی کمرے میں داخل ہوئی اور اسی لمحے فاروق عادل بھی آگیا۔

میرے لئے ترجمہ کرنا مشکل ہو گیا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ آج ان دونوں کے ساتھ کہیں بھی نہیں جاؤں گا۔ میں ترجمہ کرنے میں مصروف تھا کہ راحت سخی نے کہا، آج صبح میں اپنے گھر سے نکل کر بازار میں آئی تو میں نے ساغر صاحب کو دیکھا تھا۔ وہ بیمار ہو گئے ہیں۔ میں ترجمہ کرتے کرتے رک گیا اور راحت سخی یہ کہہ کر چلی گئی ۔ میں کل آؤں گی۔ ۔

میں نے فاروق سے کہا: میں آج جلدی فارغ نہیں ہو سکتا۔ میں نے

تقریر کا ترجمہ بھی کرنا ہے اور شام کو "جمہور دی آواز" میں اسے پڑھنا بھی ہے۔

فاروق عادل پھر بھی بیٹھا رہا۔ لیکن تھوڑی دیر بعد اکتا کر خود ہی اٹھا اور یہ کہہ کر چلا گیا: "میں شام کو ناظم کی دکان پر ملوں گا۔"

بالکل ٹھیک ہے۔ بالکل ٹھیک ہے۔ میں نے جواب دیا اور فاروق عادل کے جانے کے بعد میں نے جلدی جلدی سکرپٹ مکمل کیا اور اسے اکرم بٹ صاحب کو دے کر درخواست کی کہ اسے کسی اور سے پڑھوا لیں میرے سر میں شدید درد ہے۔ اکرم بٹ نے کہا بہت اچھا صوفی صاحب جیسا کہتے ہیں ویسا ہو جائے گا۔ میں نے ریڈیو اسٹیشن سے نکلتے ہی رکشہ لیا اور شاہ عالمی میں بہسوالوں کے ہاں پہنچ گیا۔

وہاں ایک خوش اخلاق نوجوان نے بتایا کہ ساغر صاحب آستانہ قلندریہ میں ہیں۔ آستانہ قلندریہ چوک رنگ محل میں شہباز قلندر کے خاص مریدوں نے قائم کیا ہوا تھا اور ساغر برسوں سے آستانہ میں آ رہا تھا۔ مرغ بلڈنگ کی آخری منزل کے تین چار کمروں پر مشتمل آستانہ قلندریہ ایک ایسی پر اسرار جگہ تھی جہاں شہر کے مختلف حصوں سے لوگ آ کر جمع ہوتے تھے ۔ اور ساغر سے پیار کرنے والے ہمیشہ اس کے قدموں کی چاپ کے منتظر رہتے تھے۔

شروع گرمیوں کی اس شام کو ساغر آستانہ قلندریہ کے ایک کونے میں پڑا تھا اور عاشق سائیں چرا سائیں اور سینڈو بیٹھے تھے اور دھواں ہی دھواں پھیلا ہوا تھا۔ ساغر نے میری طرف دیکھا اور مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ "بہت دنوں کے بعد دیدار ہوئے ہیں۔ کیا بہت کام ہیں۔ بخیریت تو خوشی کی بات ہے نا۔

میں نے قریب ہی بیٹھ کر کہا۔ سنا ہے تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں۔

بالکل ٹھیک ہے بابا۔ ساغر نے پیروں کے بل بیٹھتے ہوئے کہا۔ لوگ بھی عجیب ہیں، یونہی فقیر کو موضوع بنا لیتے ہیں۔ تم سناؤ تمہارے اسے حمید کا کیا حال ہے۔؟

میں چاہتا تھا کہ ساغر میرے ساتھ آستانہ قلندریہ سے نیچے اترے اور ہم کسی ہوٹل میں بیٹھ کر چائے پئیں۔ لیکن ساغر نے کہا۔

طبیعت بہت نڈھال ہے۔ یہاں کچھ سکون ہے۔ ذرا بیٹھو تمہیں تازہ شعر بھی سناتے ہیں۔ بہت دنوں سے کوئی سخن نواز نہیں ملا۔

عاشق سائیں نے بیٹھے بیٹھے کہا۔ "گاڑی چلنے والی ہے۔ میں نے وسل دے دیا ہے"۔

عاشق سائیں نے سچ مچ اپنے وردی نما لباس کی جیب سے وسل نکالی اور گارڈ کی طرح وسل بجا کر اس طرح مسکرایا جیسے اس نے سچ بول دیا ہو۔ نیم مجذوب عاشق سائیں اور سینڈو نے مسلسل بولنا شروع کر دیا۔

بے ربط جملے اور ان کے عجیب و غریب احساسات کی فضا میں ساغر بڑے سکون سے پڑا تھا۔ عاشق سائیں اور سینڈو ہر بات پہ ساغر کو مخاطب کرتے۔ حضور سن رہے ہیں نا۔

ساغر نیم وا آنکھوں سے ان کی طرف دیکھتا اور کہتا۔

میرے کان تمہاری آواز سن رہے ہیں ۔۔ ساغر ان میں ہوتے ہوئے بھی ان میں نہیں تھا اور میری طرف سے بھی غافل ہی تھا۔ لمحوں کا بوجھل پن میرے لیے برداشت کرنا مشکل ہو گیا۔ تو میں نے ساغر سے کہا۔ میں چلتا ہوں۔

اس نے جواب دیا۔ خیر ہو۔ بھلا ہو۔ پھر ملیں گے اور جلد ملیں گے۔ اسے حمید کو میرا سلام کہنا۔ اور اخلاق صاحب کہاں چلے گئے ہیں۔ مجھے ریڈیو پر ان کی آواز سنائی نہیں دیتی۔ کسی روز ریڈیو پر آؤں گا۔

آستانہ قلندریہ کی اندھیری سیڑھیاں اترتے ہوئے میرے ذہن میں کچھ نہیں تھا لیکن مجھے یہ محسوس ہو رہا تھا کہ ساغر شاید زیادہ دیر اپنے جسم کا بوجھ اٹھانے کے قابل نہ رہے۔ اگر وہ شدید بیمار ہو گیا تو ــ؟ اس خیال سے میں چونک اٹھا۔ کون اس کی تیمارداری کرے گا۔

اس قسم کے ان گنت خیال میرے ذہن کو نوچ لیتے تھے اور مجھے اپنی بے چارگی بھی ڈسنے لگی تھی۔

ریڈیو کی مصروفیت بھی بڑی بے ڈھنگی تھیں۔ پتہ نہیں ہوتا تھا کہ آج وقت پر چھٹی کر لوں گا۔ پروگراموں کے اوقات تبدیل ہوتے رہتے اور ہنگامی نوعیت کے سکرپٹ لکھنے کے لیے کوئی عذر بھی پیش نہیں کیا جا سکتا اس لیے ساغر سے ملاقاتوں کا تعین کرنا مشکل تھا۔ اگر وقت نکال کر میں اس کی تلاش میں نکلتا تو وہ اپنے ٹھکانوں سے غائب ہوتا اور اگر وہ نوبہار ٹی سٹال یا ماک لینڈ میں ہوتا تو میں ریڈیو سٹیشن میں مصروف ہوتا۔

لوہاری دروازے سے گزرتے وقت اس کے بارے میں نت نئی خبریں ملنے لگیں کہ وہ اب چھڑی کا سہارا لے کر چلتا ہے اور چلتے چلتے تھک جاتا ہے تو پھر کسی سے بات نہیں کرتا۔

چند دنوں بعد شرفو نے بتایا کہ مرشد نے عینک لگا لی ہے۔ کہتے ہیں بغیر عینک پڑھا نہیں جاتا۔

ساغر کا تصور کرتے ہی ایک نحیف و نزار جسم، چھڑی اور عینک سامنے آجاتی ہے۔ وہ شہر کی سڑکوں پر لرزاں و ترساں گھوم رہا تھا۔ اس کی بصارت مدھم ہوتی جا رہی تھی۔ وہ اب جانے پہچانے ٹھکانوں اور راستوں پر کم کم دکھائی دینے لگا تھا۔ اس نے اپنی زنبیل کندھے سے اتار کر گیلانی پریس کی بوسیدہ دیوار پر لٹکا دی تھی۔ ہسپتال روڈ سے ایبک روڈ اور لوہاری چوک سے پاک سٹینڈرڈ پریس تک کے فٹ پاتھ خالی خالی نظر آنے لگے تھے۔

چھوٹا پتریاں والا ساغر کو یاد کرکے ادھر ادھر دیکھتا تو ساغر کو نہ پاکر بیٹیوں کو پتریاں لگانا بھول جاتا۔ اخبار مارکیٹ میں استاد بجا بغل مارے تھڑے پر بیٹھا رہتا اور ہر کسی سے ساغر کے بارے میں پوچھتا۔

باباجی۔ بہت دنوں سے نظر نہیں آئے۔ خیر ہو۔ میرے دل میں بڑے بڑے خیال آرہے ہیں۔

نیا بازار اور شاہ عالمی کے درمیان اجڑے ہوئے باغ میں خلیفہ نکا کا ڈیرہ بھی بے رونق تھا۔ کالو کتا دیوار کے ساتھ تھوتھنی لگائے بیٹھا رہتا اور ذرا ذرا سی آہٹ پر چونک اٹھتا۔

ساغر کہاں چلا گیا تھا۔؟

"میں نے زادِ راہ جمع کرنا شروع کر دیا ہے۔" یہ فقرہ میرے ذہن میں کبھی کبھی گونج اٹھتا تو پاک سٹینڈرڈ پریس کے سامنے سے گزرتے ہوئے میری نظریں ساغر کو بے تابانہ تلاش کرتیں۔ سارا شہر لین دین کے کاروبار میں معروف تھا اور اس شخص کے بارے میں کسی کو سوچنے کی فرصت نہ تھی جو اٹھائیس سال پہلے کلیوں اور کرنوں سے بھی زیادہ پاکیزہ خیال لے کر لاہور میں آیا تھا اور گزرے

ہوئے سالوں کی کڑی دھوپ میں خزاں زدہ پتے کی طرح زندہ رہا تھا۔ اخلاق بنیادی سے محروم تجارت نے اس شہر سے دردِ دل نوچ لیا تھا اور شہر کے لوگوں کے پاس اتنا وقت کہاں رہا تھا کہ وہ ساغر کے بارے میں فکرمند ہوتے جو اپنے عہد کا سب سے بڑا دانشور تھا اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ وہ اس شہر کے مفلس لوگوں میں مفلس ترین انسان تھا۔

لاہور میں قیامت کی گرمی پڑ رہی تھی۔ یہ جولائی کے دوسرے ہفتے کی بات ہے۔ ایک دوپہر میں ریڈیو سٹیشن سے نکل کر لوہاری دروازے پہنچا تو مسلم مسجد کے مینار کے نیچے مجھے ساغر کی ایک جھلک دکھائی دی۔ اس نے اپنے نحیف و نزار جسم سے سیاہ چادر اتار دی تھی اور ڈھیلا ڈھالا سفید کرتہ پہنے چھڑی کے سہارے کھڑا تھا۔

میں ٹریفک چیر کر اس کی طرف بڑھا تو اس نے دھونکنی کی طرح چلتے ہوئے سانس کو روک کر مجھے دیکھا اور کہا۔

"میں تمہیں ہی یاد کر رہا تھا کہ تم بھی نظارہ کر لیتے اور ہاں تم ضرور پوچھو گے کہ فقیر نے سیاہ چادر کیوں اتار دی ہے اور سفید کرتہ کیوں پہن لیا ہے اور چھڑی دکھا کر بولا۔ سب کچھ بتاؤں گا پہلے میری صلیب دیکھو۔

یہ کہتے ہوئے پھر اس کا دم اکھڑنے لگا اور اس نے کھانس کر بلغم تھوکی تو دم لے کر کفن نما سفید کرتے کو چھو کر بولا۔

مقتل کی طرف جانے کی گھڑیاں آگئی ہیں اور میں نے کفنی پہن لی ہے۔ میں نے جلدی سے پوچھا۔ لیکن تم ہو کہاں۔ اس نے اپنی بے نور ہوتی آنکھوں سے عینک اتار کر پرے پھینک دی اور بولا۔" اب کچھ دیکھنے کو دل نہیں چاہتا

رجا بھی کہاں سکتا ہوں۔ صرف چولا بدلنے گیا تھا۔ اب تو میں نے سب تیاریاں مکمل کر لی ہیں۔"

ٹریفک کے شور میں ساغر کی آواز ڈوب ڈوب جاتی تھی۔ پھر وہ میرے آخری سوال کا جواب دیئے بغیر لوہاری کے اندر اپنے لرزیدہ جسم کو کھینچ کر لے گیا۔

رات کو مجھے دیر تک نیند نہ آئی اور مجھے یوں محسوس ہوتا رہا جیسے روشنی اپنے آپ کو سمیٹ رہی ہے . . . . انہی دنوں

ایک دوپہر طالب چشتی روتا ہوا ریڈیو اسٹیشن میں داخل ہوا اور اس نے گلوگیر آواز میں بتایا۔ بابا جی۔ خون تھوک رہے ہیں اور پان گلی کے باہر عزیز چھولیاں والے کے تھڑے کے نیچے پڑے ہیں۔

میں کام جاری نہ رکھ سکا اور طالب کے ساتھ لوہاری پہنچا تو ساغر وہاں نہیں تھا۔ ہم نے انار کلی، ایبک روڈ، آبکاری روڈ۔ پیسہ اخبار شاہ عالمی اور سوتر منڈی میں ہر جگہ اسے تلاش کیا لیکن ساغر کا کوئی نشان نہ ملا۔

دوسرے دن میں ریڈیو اسٹیشن جانے کی بجائے صبح ہی صبح لوہاری چلا گیا اور اُسے مکتبہ جدید کے سامنے دیکھ کر میرا دم گھٹنے لگا۔ راہگیر اسے دیکھ کر آگے بڑھ جاتے تھے اور دوکاندار اپنے گاہکوں میں مصروف تھے۔ حالانکہ سارا شہر اسے خون تھوکتے ہوئے اس طرح دیکھ رہا تھا۔ جیسے لوگ رومن اکھاڑے میں جمع ہوں اور خونیں منظر دیکھ کر تالیاں بجا رہے ہو جس میں ساغر کفن پہنے بوجھل سانسوں کے ساتھ نیم جاں ہو کر اپنے آپ کو گھسیٹ رہا تھا۔ اس کے کفن پر خون کے دھبے اس طرح جگمگا رہے تھے جیسے خنجر بکف جلاد اس پہ ٹوٹ پڑے ہوں۔

اس نے بند ہوتی ہوئی آواز میں کچھ کہنا چاہا تو اس کے منہ سے خون نکل کر اس کے ہونٹوں پر پھیل گیا۔ اس نے سفید آستین سے پونچھ کر دوبارہ کچھ کہنے کی آرزو کی تو خون کی لکیریں اس کی کفنی پر بہنے لگیں۔ اپنے ہی خون میں تر اور ساغر صدیقی اس بنتے بستے شہر میں کئی دنوں تک مقتل کا نظارہ بنا رہا اس وقت ملک کی سب سے بڑی ادبی تنظیم رائٹرز گلڈ کے انتخابات پر پانی کی طرح روپیہ بہایا جا رہا تھا اور بہت سارے خوشحال ادیب اور شاعر رائٹرز گلڈ سے معذوروں کا وظیفہ بھی پا رہے تھے لیکن ساغر جس نے عمر بھر صلہ وستائش سے بے نیاز ہو کر حسن پیار اور رحم کے گیت تراشے تھے۔ اپنے خون آلود کفن میں لپٹا تیسرے دن بے کسی کے ساتھ مر گیا تھا۔

اُسے کس کفن پہنایا اور اسے کون لوگ دفن کرنے قبرستان گئے۔ یہ شکستِ ساغر کی آخری گمشدہ کڑی ہے اور جس طرح کسی یہ معلوم نہیں کہ اس نے کس ماں کی گود میں آنکھ کھولی۔ کس باپ کی شفقت سے محروم ہوا اور کس بھائی نے اسے پیار سے پکارا۔ اس طرح یہ بھی معلوم نہیں کہ اسے قبر میں اتارنے والے کون تھے؟

ساغر کو قبرستان میانی میں دفن ہوئے نو سال بیت گئے ہیں اور میں اس کی زندگی کے بکھرے بکھرے مناظر ترتیب دیتے ہوئے اس کی آخری آرام گاہ پر لگا ہوا ایک کتبہ پڑھ رہا ہوں۔ جس پر یہ الفاظ کندہ ہیں۔

عاشق کو سجدہ کرنے کی مستی میں اس بات سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ کہ اس کی پگڑی کہاں گری ہے اور اس کا سر محبوب کے قدموں پر کس انداز سے گرتا ہے۔

لیکن اس کے کسی مداح نے اس کے کتبے پر یہ الفاظ لکھوائے ہوئے ہیں کہ ساغر کا قاتل یہ معاشرہ ہے اور نیچے یہ شعر درج ہے ۔

سنا ہے اب تلک واں سونے والے چونک اٹھتے ہیں
صدا دیتے ہوئے جن راستوں سے ہم گزر آئے

تاریخ وفات ۱۹ جولائی ۱۹۷۴ء ۔

دوستو! ساغر صدیقی کی فنی عبادتوں اور اس کی پاکیزہ شخصیت کے خدوخال لفظوں میں بیان کرنا مشکل ہے۔ اس کی زندگی میں جھانک کر دیکھنا میری ہمتوں سے باہر ہے اور شکستِ ساغر کے عنوان سے اس کی یادوں کو ترتیب دینا میری ایک ایسی آرزو تھی جسے میں نے برسوں سے اپنے دل میں سنبھال سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔

اور جب بھی میں اس کے بارے میں لکھنے کے لیے قلم اٹھاتا ہوں تو موتیوں کے پھولوں کی خوشبو میرے احساس میں پھیل جاتی ہے اور پھر اچانک ہی موتیے کے پھول خون کے دھبوں میں بدل جاتے ہیں۔

قبرستان میانی کے قریب سے گزرتے ہوئے مجھے اکثر وہ ساغر صدیقی یاد آجاتا ہے جو برسوں پہلے مجھے اس شہر میں ملا تھا۔ گھنگھریالے بالوں اور خوبصورت آنکھوں اور خوبصورت چہرے والا ساغر صدیقی اور پھر ایک تباہ حال شاعر جس کی میت پر کوئی اپنا آنسو بہانے والا نہ تھا۔ زندگی کی المناکیوں کا ایک ایسا عنوان بن گیا جس کو لکھنے کے لیے لہو کے چھینٹے اڑانے پڑتے ہیں۔

شکستِ ساغر ایک فرد کا المیہ نہیں اس پورے سماج کا المیہ ہے جس سے بے رحم سرمایہ دارانہ نظام نے احساسِ دردمندی چھین لیا ہوا ہے ۔ اور

افراد کو ایک دوسرے سے اس طرح الگ کر کے رکھ دیا ہے کہ وہ بدترین حالتِ بیگانگیِ ذات میں مقید ہو کر رہ گئے ہیں ۔

ساغر نے تمام زندگی دار و رسن پر گزاری، لیکن مرنے کے بعد اس سے زندگی کوئی بھی نہ چھین سکا۔ اس نے تو اپنے لہو سے فکر و فن کا سنگھار کیا تھا فاقوں کی سیاہ راتوں اور بے چارگی میں ڈوبی ہوئی صبحوں میں بھی اس نے سچے خیالوں اور پُرنور جذبوں کے فانوس روشن رکھے ۔

ساغر کی یہ عظیم عبادتیں اس کی ابدی زندگی کی ضمانت بن گئیں۔ اس نے بے گھروں کے دکھ میں اپنا گھر بنانے کے خیال کو جھٹک دیا۔ ننگے زخمی پیروں کو دیکھ کر خود تپتی ہوئی سڑکوں پہ ننگے پاؤں چلتا رہا۔ برہنہ جسموں کی بے وقعتی پر سیاہ پوشی کرنے والے کے حوصلے کا مقابلہ کون کر سکتا ہے اور بھوکے معدوں کے غم میں فاقوں کے دوزخ میں جلنا اسی کا کمال تھا۔

یہ وہ انسانی کمال ہے جو صرف آج کے بے برکت دور میں ساغر کی زندگی میں نظر آتا ہے اور یہی وہ حقیقت ہے جو صدیوں تک اس سے اہلِ درد کی محبتوں کو زندہ رکھے گی ۔

موت اک انگبیں کا ساغر ہے
زندگی زہر کی پیالی ہے

لیکن اس کے کسی مداح نے اس کے کتبے پر یہ الفاظ لکھوائے ہوئے ہیں کہ ساغر کا قاتل یہ معاشرہ ہے اور نیچے یہ شعر درج ہے۔

سنا ہے اب تلک واں سونے والے چونک اٹھتے ہیں
صدا دیتے ہوئے جن راستوں سے ہم گزر آئے

تاریخِ وفات ۱۹ جولائی ۱۹۷۴ء۔

دوستو! ساغر صدیقی کی فنی عبادتوں اور اس کی پاکیزہ شخصیت کے خدوخال لفظوں میں بیان کرنا مشکل ہے۔ اس کی زندگی میں جھانک کر دیکھنا میری ہمتوں سے باہر ہے اور شکستِ ساغر کے عنوان سے اس کی یادوں کو ترتیب دینا میری ایک ایسی آرزو تھی جسے میں نے برسوں سے اپنے دل میں سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔

اور جب بھی میں اس کے بارے میں لکھنے کے لیے قلم اٹھاتا ہوں تو موتیوں کے پھولوں کی خوشبو میرے احساس میں پھیل جاتی ہے اور پھر اچانک ہی سوچ کے پھول خون کے دھبوں میں بدل جاتے ہیں۔

قبرستان میانی کے قریب سے گزرتے ہوئے مجھے اکثر وہ ساغر صدیقی یاد آجاتا ہے جو برسوں پہلے مجھے اس شہر میں ملا تھا۔ گھنگھریالے بالوں اور خوبصورت آنکھوں اور خوبصورت چہرے والا ساغر صدیقی اور پھر ایک تباہ حال شاعر جس کی میت پر کوئی آنسو بہانے والا نہ تھا۔ زندگی کی لغزشوں کا ایک ایسا عنوان بن گیا جس کو لکھنے کے لیے لہو کے چھینٹے اڑانے پڑتے ہیں۔

شکستِ ساغر ایک فرد کا المیہ نہیں اس پورے سماج کا المیہ ہے جس سے بے رحم سرمایہ دارانہ نظام نے احساسِ دردمندی چھین لیا ہوا ہے۔ والسلام

افراد کو ایک دوسرے سے اس طرح الگ کر کے رکھ دیا ہے کہ وہ بدترین حالتِ بیگانگی ذات میں مقید ہو کر رہ گئے ہیں۔

ساغر نے تمام زندگی دار و رسن پہ گزاری، لیکن مرنے کے بعد اس سے زندگی کوئی بھی نہ چھین سکا۔ اس نے تو اپنے لہو سے فکر و فن کا سنگھار کیا تھا فاقوں کی سیاہ راتوں اور بے چارگی میں ڈوبی ہوئی صبحوں میں بھی اس نے سچے خیالوں اور پُرنور جذبوں کے فانوس روشن رکھے۔

ساغر کی یہ عظیم عبادتیں اس کی ابدی زندگی کی ضمانت بن گئیں۔ اس نے بے گھروں کے دکھ میں اپنا گھر بنانے کے خیال کو جھٹک دیا۔ ننگے زخمی پیروں کو دیکھ کر خود تپتی ہوئی سڑکوں پر ننگے پاؤں چلتا رہا۔ برہنہ جسموں کی بے وقعتی پہ سیاہ پوشی کرنے والے کے حوصلے کا مقابلہ کون کر سکتا ہے اور بھوکے معدوں کے غم میں فاقوں کے دوزخ میں جلنا اسی کا کمال تھا۔

یہ وہ انسانی کمال ہے جو صرف آج کے بے برکت دور میں ساغر کی زندگی میں نظر آتا ہے اور یہی وہ حقیقت ہے جو صدیوں تک اس کے اہلِ درد کی محبتوں کو زندہ رکھے گی۔

موت اک انگبین کا ساغر ہے
زندگی زہر کی پیالی ہے